جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

جولائی ۱۹۹۴

مُدیر: خرّم مُراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ
ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۰ | جولائی ۱۹۹۴ محرم الحرام ۱۴۱۵ | عدد ۷

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰، فون نمبر ۸۔ ۷۵۷۰۱۲۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰، فون نمبر ۷۲۳۴۰۱۴۔ ۷۲۳۶۶۶۵، پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابلِ وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۱۰ روپے ○ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۵۰۰ روپے، یورپ: ۶۰۰ روپے، امریکہ و آسٹریلیا: ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

اِدارۂ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

اس سال کا بجٹ پیش کرنے کی "سالانہ رسم" ادا کی جا چکی ہے۔ بجٹ صرف آمد و خرچ کی جمع تفریق کا نام نہیں، نہ یہ صرف اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ہوتا ہے۔ اسے تو ملک کے روشن مستقبل اور عام آدمی کے لیے بہتر زندگی کی طرف پیش رفت کے لیے حکومت کی سوچ، سمت، پالیسیوں اور اقدامات کا حامل اور عکاس ہونا چاہیے۔ ہمیں سب سے بڑھ کر اسی پہلو سے اس بجٹ سے دلچسپی ہے۔

وزیر خزانہ نے صحیح فرمایا ہے کہ "بجٹ میں قوم کے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ شیشہ کی ایک ایسی گیند ہے، جو بصیرت رکھنے والے پر ماضی اور حال کے سارے راز عیاں کر دیتی ہے"۔ ہماری بصیرت جو کچھ دیکھ رہی ہے، اس کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حالیہ حکومت کا یہ بجٹ، کیسی ہی دھوم دھام سے آیا ہو اور کتنے ہی حسین خوابوں کا یقین ولا رہا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اپنی سوچ اور نہج میں ماضی کی کسی بھی حکومت کے بجٹ سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ اس کا قبلہ وہی ہے، اہداف و ترجیحات وہی ہیں، جو قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے ہر بجٹ کی، بلکہ ہماری پوری تہذیبی و معاشی زندگی کی صورت گری کرتی رہی ہیں۔ اس شیشہ میں جو خواب صاف نظر آ رہے ہیں وہ بڑے بھیانک ہیں: روز بروز بڑھنے والے کمر توڑ ٹیکس، ہوش ربا گرانی، سود اور قرضوں کا عفریت جو بالآخر ملک کی ساری آمدنی نگل لے گا، آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی سنہری زنجیریں، قومی مقاصد کی مکمل پامالی۔ "گھٹ گئے انسان، بڑھ گئے سائے"، یہاں تک کہ انسان معدوم ہو جائے گا اور ہر سو اندھیرا چھا جائے گا۔

بجٹ کے اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد بھی، ہمیں یقین ہے کہ تمام وعدوں کے باوجود منی بجٹ کے نوافل ادا کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بجلی کے نرخ بڑھنا تو یقینی ہے، دوسری قیمتیں

بھی قسطوں میں بڑھائی جاتی رہیں گی' انتظامی اخراجات اسراف کی وجہ سے بے تحاشا بڑھتے رہیں گے' اور آمدنی تخمینوں سے کم ہونے کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں میں کانٹا چھانٹی ہوتی رہے گی۔

عام آدمی تو بجٹ کی طرف ایسی خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے شکاری کے جال میں پھنسا ہوا ایک پرندہ اس کے چاقو کی طرف۔ وہ بڑی بے بسی کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے' لیکن جانتا ہے کہ رگِ گلو سے خون کے قطرے ٹپکائے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں' ورنہ وہ "روشن مستقبل کی نوید" سننے کے لیے بھی ترس جائے گا۔ برس ہا برس کے تجربات نے اسے بڑا سیانا بنا دیا ہے۔ "ترقی' روشن مستقبل اور بہتر معیارِ زندگی" کے خوش نما الفاظ کے کھوکھلے پن سے وہ خوب واقف ہو چکا ہے' اور ان کے حوالہ سے اب وہ بجٹ پر نظر ڈالنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔

اعداد و شمار اور اصطلاحات کے جس گورکھ دھندے کی زبان میں بجٹ اس کو اچھے مقدر کا مژدہ سناتا ہے وہ بھی اس کے لیے ناقابلِ فہم ہے' اسی طرح جس طرح وہ زبان جس میں دفتر کی فائلوں اور عدالت کے فیصلوں میں اس کے مقدر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ کُل قومی پیداوار (GDP)' فی کس آمدنی (PCI)' شرحِ نمو (rate of growth) جیسے الفاظ سے وہ خوب جانتا ہے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس کو معلوم ہے کہ ہندسوں کے اس سمندر میں وہ صرف ایک ہندسہ ہے' جس کی کوئی حیثیت نہیں' کوئی نام نہیں۔ یہ پیمانے کچھ فی صد گھٹ جائیں یا بڑھ جائیں' اس کے مقدر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

عام آدمی کو بجٹ سے صرف ایک پہلو سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ٹیکس کتنا اور بڑھے گا؟ قیمتیں کتنی اور چڑھیں گی؟ (گھٹنے کا تو سوال ہی نہیں)۔ زندگی کتنی اور مشکل ہو جائے گی؟ اس کے نزدیک بجٹ نہ مستقبل کی صورت گری کا نام ہے' نہ ترقی کے منصوبوں کا' وہ ٹیکس اور صرف ٹیکس لگانے کا' قیمتیں چڑھانے کا' اور عام لوگوں کی جیبوں سے دولت کھینچ کر' کروڑوں اور اربوں کی مقدار میں' ملک کے چند لوگوں اور بیرونی آقاؤں کی جیبوں تک منتقل کر دینے کا نام ہے۔

ہمارے ہر بجٹ کا قبلہ معاشی ترقی رہا ہے۔ پورے عالم میں مغربی طریقہ کے مطابق "معاشی معراج" کے پیچھے جو اندھا دھند دوڑ لگی' اس کے نتیجہ میں' ورلڈ بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق: "۳۰ سالہ ترقی کے نتیجہ میں امیر ترین ۱/۵ لوگوں کی آمدنی' ۱/۵ غریب ترین لوگوں سے ۳۰ گنا کے مقابلہ میں ۱۵۰ گنا زیادہ ہو گئی"۔ ہمارے ہر بجٹ نے بھی یہی کرشمہ دکھایا ہے۔

ہر بجٹ سے پہلے عام آدمی کو صرف یہی سوال پریشان رکھتا ہے کہ اب اس کی جیب سے اور

کتنا پیسہ کھینچا جائے گا۔ لیکن اس سال کسی سے بھی پوشیدہ نہ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اخفا' بجٹ سازی کی ایک بڑی اہم روایت رہی ہے۔ اب کے بجٹ ساز اپنے سب راز بجٹ سے پہلے ہی فاش کر چکے تھے۔ رہی سہی کسر وزیر اعظم نے پوری کر دی جب انھوں نے وزیر خزانہ کی تقریر سے ایک دن پہلے ٹی وی پر اپنی بجٹ اسپیچ پیش کرنے کی نئی روایت ڈالنا ضروری سمجھا۔ پھر اگر اخبار والے بھی ایک دن پہلے ہی بجٹ لے اڑے تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش۔ اس پیشگی انکشاف سے کوئی نقصان تو نہ ہوا' ہاں' حکومت کی اپنے راز کو راز رکھنے کی اہلیت ضرور مشتبہ ہو گئی۔

اس سال بڑی چابک دستی سے لوگوں کو غیر معمولی خوف و حزن اور یاس و ہراس میں بھی مبتلا کیا گیا۔ یہاں تک کہ بجٹ سے قبل لوگوں کے ذہن و دل ٹیکس کے خوف کے علاوہ ہر خوف سے خالی ہو چکے تھے۔ اس ٹیکنیک کے نتیجہ میں کتنے لوگ نفسیاتی مریض بن گئے ہوں گے' ابھی اس کا حساب ممکن نہیں۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ فوری شدید جھٹکے سے بچ گئے' اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ گولی اتنی کڑوی بھی نہ نکلی۔ وزیر خزانہ نے بھی لوگوں کو فوری شاک سے بچانے میں بڑا کام کیا۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بجٹ تقریر کو حقائق سے خالی رکھا' لوگوں کو آگاہ کرنے کے بجائے غافل رکھنے کا اہتمام کیا' اور انھیں پتا ہی نہ چلنے دیا کہ وہ ان کی جیبوں پر کہاں اور کتنا ہاتھ مار گئے۔ سب سے بڑا نیا ٹیکس سیلز ٹیکس ہے۔ ان کی تقریر میں کچھ ذکر نہیں کہ کس پر کتنا لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت نے یہ ٹیکس لگانے کا اختیار پارلیمان سے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کو منتقل کر دیا ہے۔

بجٹ پہلے سے مختلف نہیں' لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں عام لوگوں پر ۲۸ ارب روپے کے نئے بالواسطہ ٹیکسوں کا جو کمر توڑ بوجھ ڈالا گیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن ٹیکسوں کا یہ بوجھ معاشی ترقی کی اسی فکر اور ماڈل کا منطقی نتیجہ ہے جو ہر بجٹ سازی میں رہنما رہا ہے' اور اس بوجھ کو آج یا کل قوم پر پڑنا ہی تھا۔ ہمیں یہ پیش گوئی کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ آنے والے ہر سال میں خوف و حزن میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا' اور ٹیکسوں میں بھی۔

۷

پاکستان آزاد ہوا' تو یہاں کے حکمران ترقی کی اس سوچ اور ماڈل پر دل و جان سے فریفتہ تھے ۲۰
جو انھوں نے مغرب میں دیکھا تھا۔ مغرب میں ۳۰ کے عشرہ کی عظیم کساد بازاری کے بعد سے ۶۰ کے عشرہ تک' ترقی کے بارہ میں جس فکر کا سکہ چلتا رہا وہ یہ تھی:

۱- معاشی ترقی ہی' ہر قسم کی ترقی' بلکہ مکمل انسانی زندگی کی ترقی کا نام ہے۔
۲- معاشی ترقی کا راز تیز سے تیز تر صنعت کاری میں پوشیدہ ہے۔
۳- تیز سے تیز صنعت کاری کی اصل کلید سرمایہ ہے۔
۴- یہ سرمایہ ہر طرح کے بالواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکس لگا کر اور بچتوں سے حاصل کرو۔ زراعت کے وسائل بھی صنعت کاری کی طرف منتقل کرنے میں تامل نہ کرو۔ ٹیکسوں سے نہ ملے تو قرضے لو' اندر سے بھی اور بیرون ملک سے بھی' جتنے' جہاں سے' اور جن شرائط پر مل جائیں۔

۴۰ اور ۵۰ کے عشروں میں مقبول' ترقی کا کیمبرج ماڈل اسی مفروضہ پر بنا تھا کہ جتنا سرمایہ لگایا جائے گا' اتنی ہی پیداوار بڑھے گی۔ روزینس ٹائن - روڈان نے یہ بات یوں کہی "ایک بڑے دھکے کی ضرورت ہے' اس سے معیشت ایک خود کفیل صنعت کاری اور سریع ترقی اور نشوونما کے مقام پر پہنچ جائے گی"۔ (ورلڈ ڈیویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۱' ص ۴' ۳۱' ۳۵)

خود مغرب میں اس فکر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ لیکن جس طرح ہمارے ہاں نئی سائنس مغرب سے ۵۰ سال بعد پہنچتی ہے' ترقی کے نئے نظریات بھی ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یا کم سے کم حکمرانوں کو پتا نہیں چل سکا ہے۔ پہنچ بھی جائیں تو ۴۰ سال تک مغربی ماڈل کی اندھا دھند پیروی کے زہریلے پھلوں اور کانٹوں سے ہم کو یکایک نجات نہ ملے گی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ماڈل مغرب کا تھا' عملی جامہ پہنانے والے "مشرق" کے وہ جاگیردار اور سرمایہ دار رہے ہیں جو وہاں کے اخلاق و کردار اور دیانت سے بھی خالی ہیں۔ چنانچہ اس ماڈل سے اگر کچھ نفع ہو سکتا تھا' وہ بھی ہمیں نصیب نہ ہوا۔ آج بھی سیاسی و معاشی فیصلہ سازی کے مختار وہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے بددیانتی کی جو چھلنیاں لگا دیں' ان کی وجہ سے سرمایہ کاری سے پیداوار میں جو اضافہ ہو سکتا تھا وہ بھی نہ ہوا' اور قرضوں اور ٹیکسوں کا بیشتر حصہ لوٹ کھسوٹ اور اسراف کی نذر ہو گیا۔ اور اب ان چھلنیوں سے مسندِ اقتدار پر بیٹھے وہ لوگ کیسے دست بردار ہوں جن کی جیبوں ہی میں چھن چھن کر سب کچھ پہنچ رہا ہے۔ مغرب میں سوچ اس لیے بدلی کہ ان کی توقعات کے مطابق ان کے ماڈل سے غربت کم نہ ہوئی۔ لیکن ہمارے فیصلہ ساز جب دیکھ رہے ہیں کہ یہ نسخہ ان کو امیر سے امیر تر بنا رہا ہے' تو وہ اسے کیوں تبدیل کریں۔

سرمایہ اور قرضوں پر ترقی اور ملک چلانے کو منحصر کر دینے کی وجہ سے آج ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اپنی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ نہ دفاع پر خرچ کر رہے ہیں' نہ معاشی ترقی پر' نہ

عوام کی فلاح پر' بلکہ صرف سود اور قرض چکانے میں لگا رہے ہیں۔ اس سال کی متوقع آمدنی ۲۳۳ ارب ہے۔ اب اس میں سے ۱۳۶ ارب روپے (۵۸ فی صد) قرضوں کی خدمت میں جائیں گے۔ قرضوں کے ساتھ اگر ہم دفاع کے ۱۰۲ ارب بھی ملا لیں' تو ساری آمدنی ختم ہو جائے گی۔ اگر حکومت مزید قرضے نہ لے' نہ نئے ٹیکس لگائے' تو ہمیں کسی اور چیز پر خرچ کرنے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔

آج ہم لگ بھگ ۱۴۰۰ ارب کے مقروض ہیں' ۷۰۰ ارب کے اندرونی قرضے' ۷۰۰ ارب کے بیرونی۔ یہ قرضے تقریباً ہماری مجموعی قومی پیداوار (G D P) کے برابر ہیں۔ گویا ہر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ۱۲ ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے۔ قرضوں کے بوجھ میں اضافہ کی رفتار بھی دیکھیے۔ ۱۹۸۱ میں اندرونی قرضے صرف ۵۸ ارب تھے' ۱۳ سال میں وہ ۱۲ گنا بڑھ کر ۷۰۰ ارب ہو گئے۔ چار سال پہلے ۱۹۹۰ میں بھی یہ ۳۸۱ ارب تھے۔ بیرونی قرضے اس رفتار سے تو نہیں بڑھے' کہ ان کو بڑھانا ہمارے حکمرانوں کے بس میں نہ تھا' لیکن ۱۹۸۱ کے ۸.۷ ارب ڈالر' ۱۹۹۴ میں ڈھائی گنا بڑھ کر ۲۰.۴۳ ارب ہو گئے۔ ایوب خاں کے "سنہری دور" میں' ۱۹۶۰ کے ۱۴۵ ملین ڈالر کے قرضے دس سال میں ۲۰ گنا بڑھ کر ۳ ارب ڈالر (۱۹۷۰) ہو گئے تھے۔

یہ قرضے صرف معاشی ترقی کے لیے نہیں لیے گئے۔ کچھ وسائل کی کمی' لیکن بیشتر اسراف' لوٹ کھسوٹ اور ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے ہم نے مسلسل اپنے وسائل سے زیادہ خرچ کیا' اور خسارے پورا کرنے کے لیے مزید قرضے لیے۔ پرانے قرضے ادا نہ کر سکے' تو انھیں ادا کرنے کے لیے بھی پھر نئے قرضے لیے۔ قرض لے کر خسارہ پورا کرنا' اور سود پر قرض لے کر قرض مع سود ادا کرنا' یہ ایسا چکر ہے جس کا نتیجہ روز بروز بڑھتے ہوئے مزید قرضوں کے بوجھ' مزید خسارے' مزید نئے نئے ٹیکس اور مزید کمر توڑ گرانی کے سوا کچھ نہیں۔ اگلے سال میں ہم ۸۲ ارب کے بیرونی قرضوں کی امید لگائے ہوئے ہیں' اس میں سے ۵۳ ارب سود اور قرض کی ادائیگی میں واپس چلے جائیں گے۔

قرضے اور ان میں اضافہ کی اس ہوش ربا رفتار میں کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ حالیہ بجٹ میں خسارہ ۳۵ ارب روپے دکھایا گیا ہے' جو قرضوں اور ٹیکسوں سے پورا کیا جانا پیشِ نظر ہے۔ لیکن اوّل تو آمدنی کے تخمینے خود مشکوک ہیں۔ ایک خبر کے مطابق خسارہ کم دکھانے کے لیے آمدنی کے تخمینہ میں ۱۴ ارب کا مصنوعی اضافہ کیا گیا ہے (فرنٹیر پوسٹ' ۱۰ جون ۱۹۹۴) ۔ آئی ایم ایف کے دباؤ سے درآمدات پر ڈیوٹیاں کم کرنے کے نتیجہ میں' دوسرے نقصانات سے قطعِ نظر'

آمدنی میں ۱۵ ارب روپے کی کمی یقیناً واقع ہو گی۔ لیکن جنرل سیلز ٹیکس اور دیگر ذرائع سے متوقع ۲۸ ارب ڈالر کی آمدنی کی توقع ایک امید موہوم ثابت ہو گی۔ دوسرے' ۸۲ ارب کا مزید خسارہ بیرونی امداد کے خوش نما نام میں چھپایا گیا ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم ۱۵ ارب سے زیادہ اندرونی قرضے نہیں لیں گے۔ اس کی بھی پابندی نہیں ہو گی۔ اس طرح کل خسارہ کم سے کم ۱۴۱ ارب کا ہے۔ یہ ٹیکسوں سے جتنا وصول ہو جائے' باقی قرضے لے کر ہی پورا کیا جائے گا۔

یہ سب قرضے ہر سال "خدمت" کا تقاضا کریں گے۔ سب سے بڑا بوجھ سود کا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ساری نقد آمدنی سود میں دے کر بھی جان نہ چھوٹے گی۔ ۹۵ - ۱۹۹۴ میں قرضوں کی "خدمت" میں ۱۰۳ ارب کا سود بھی شامل ہے۔ ۸۳ ارب اندر کا' ۲۰ ارب باہر کا۔ سود کی اس رقم کے مقابلہ میں معاشی ترقی کے لیے صرف ۹۰ ارب اور دفاع کے لیے ۱۰۲ ارب دستیاب ہیں۔ ۱۹۸۴ میں دفاع کے ۳۲ ارب اور ترقیاتی خرچ کے ۳۳ ارب کے مقابلہ میں سود کے ۱۹ ارب تھے۔ اب صورتِ حال الٹ گئی ہے۔ سودی قرضوں کا کاروبار تو معاشی ترقی کے نام پر ہی شروع ہوا تھا' لیکن ۱۹۸۸ سے مسلسل ہم معاشی ترقی پر جتنا خرچ کر سکے ہیں اس سے زیادہ قرضوں کی خدمت پر خرچ کرنا پڑا ہے۔ اب قرضوں اور سود کی ادائیگی کا یہ بوجھ ہر سال بڑھتا جائے گا' جب تک سوچ' پالیسیوں' اقدامات اور کردار میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آتی۔

سود کو تجارت قرار دے کر' اور علانیہ حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے' ہم پر ہر وہ وعید صادق آ رہی ہے جو اللہ نے ہم کو سنائی ہے۔ سود جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے' دولت اور آمدنی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ **یمحق اللہ الربوٰ** کے یہی معنی ہیں۔ اس شخص کی طرح جس سے شیطان لپٹ گیا ہو' ہمارے حکمرانوں کے حواس خبط ہو چکے ہیں' انھیں اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں رہ گئی ہے' وہ اندھا دھند آئی ایم ایف کے "سنہری بچھڑے" کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ کے نتیجہ میں اور کیا بھگتنا ہو گا' یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۹۸۴ میں دفاعی بجٹ' حکومتی اخراجات کا تقریباً نصف' یعنی ۳۲ ارب روپے تھا۔ حالیہ بجٹ میں رقم تو ۱۰۲ ارب ہو گئی ہے' لیکن تناسب تقریباً ۳۵ فیصد ہو گیا ہے۔ پاکستان کو درپیش خطرات کی بنا پر' اس بات میں بڑا وزن ہے کہ اس بجٹ میں اضافہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دفاع کے بارہ میں ہمارے ہاں صحت مند' غیر جذباتی اور تعمیری مباحثہ کی روایت بالکل مفقود ہے۔ اس ضمن میں

اب چند سوالات پر ایسے مباحثہ کا آغاز ہونا چاہیے۔

ایک یہ کہ کیا آج کے زمانے میں صرف اسلحہ اور قوم کے وردی پوش حصہ کے بل پر ملک کا دفاع ممکن ہے ؟ جس قوم کو تعلیم، صحت، غذا، اور جذبوں اور کردار کی تعمیر فراہم کرنے کے لیے کچھ نہ کیا جا رہا ہو، کیا وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے ؟ کیا پوری قوم کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنی تعمیر اور حملہ آور کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار کرنا اور جذبۂ جہاد سے سرشار کرنا ضروری نہیں ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکمراں خود ایک ایسی قوم کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوں ؟ اگر ضروری ہے تو اس بارہ میں ہم کیا کر رہے ہیں، اور ہمارے بجٹ میں کیا تجویز کیا گیا ہے ؟ ہمیں کوئی ایسی مد نظر نہیں آئی جو اس اہم ترین ضرورت کو پورا کرے۔ دوسرے یہ کہ دین، کلچر، کردار، تعلیم اور صحت کی ضروریات قربان کر کے اگر ہم اپنے دفاع پر ۵۰ فی صد تک بجٹ خرچ کرتے ہیں، تو ملک کی سلامتی کے لحاظ سے اس کا حاصل کیا رہا ہے ؟ تیسرے یہ کہ اگر دفاع کا انحصار بھی بیرونی طاقتوں کی امداد اور ان کی خوشنودی پر ہے، تو کیا ہماری فوج، کشمیر، نیوکلیر پروگرام، داخلی انتشار، جیسے اہم مسائل پر قومی مفادات کی حفاظت کے لیے جرات سے کھڑی رہے گی؟

ہمیں افسوس ہے کہ ماضی کے بجٹوں کی طرح ہمارے حالیہ بجٹ میں بھی قرضوں اور سود کے اس جال سے نکلنے، اور دفاع کے خطیر اخراجات پر معقول پالیسی وضع کرنے کے لیے کسی سوچ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

سب جانتے ہیں کہ لوگ ٹیکس نہیں دیتے۔ مگر کیوں نہیں دیتے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر ملک کو ترقی کرنا ہے، تو ملک کے لوگوں کو حکومت کو مالی وسائل فراہم کرنا ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے ٹیکس بھی لگانا ہوں گے۔ لیکن باشندوں پر ٹیکس لگا کر وسائل جمع کرنے میں چند بنیادی مسائل حائل ہیں۔ ایک یہ کہ کون کتنا ٹیکس دے، یعنی مختلف حیثیت کے لوگوں کے درمیان ٹیکسوں کے بوجھ کی تقسیم کا منصفانہ نظام کیا ہے ؟ دوسرے کن چیزوں پر ٹیکس لگتا ہے، اور کن پر نہیں لگتا ؟ تیسرے یہ کہ ٹیکس کس طرح وصول کیا جاتا ہے ؟ چوتھے کہ یہ ٹیکس کس طرح خرچ کیا جاتا ہے؟ لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کی خالی مزید جیبیں خالی کی جاتی ہیں، بھری جیبیں ابل رہی ہوتی ہیں۔ ان کی ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس لگتا ہے، امیروں کی بے تحاشا آمدنی پر نہیں۔ ٹیکس سے یا قرض ادا ہوتے ہیں، یا دفاع، یا حکومتی عہدیداروں کی شاہ خرچیاں۔ پھر وہ ٹیکس کیوں دیں!

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے ان مسائل کا اپنے بجٹ میں سرے سے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ہے۔ بلکہ ان کو بالکل نظرانداز کر کے ۲۸ ارب کے نئے بالواسطہ ٹیکسوں کا بار ڈال دیا ہے' اور پرانے ٹیکسوں کے نظام کو زیادہ کار گر بنانے کے لیے چند خون خشک کرنے والی (draconian) تجاویز پیش کر دی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بنیادی مسائل حل کیے بغیر' نہ مطلوب تعداد میں ٹیکس دہندگان کی صورت نظر آئے گی' نہ مطلوب مقدار میں ٹیکسوں کی امید بر آئے گی۔ صرف وہی مچھلیاں جال میں پھنسیں گی جو مجبور اور بے بس ہوں گی۔

دنیا میں کوئی بھی خوشی خوشی اپنی کمائی حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھماتا' ہر جگہ ٹیکس چوری ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان جیسے ملکوں میں جس پیمانہ پر یہ کام ہوتا ہے' اس کے ساتھ ملک کا ترقی کرنا ممکن نہیں۔ کراچی کے اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ کمپنیوں میں صرف ۲۵ فی صد ٹیکس دہندگان ہیں۔ صرف ۲۰ نے گذشتہ سالوں میں مسلسل ٹیکس دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم نے خود حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ۳۰۰ ٹیکسٹائل ملیں صرف ۱۴ کروڑ ٹیکس دیتی ہیں۔ شخصی طور پر ٹیکس دہندگان کی تعداد صرف ۱۱ لاکھ ہے۔

ٹیکس نادہندگی کی سب سے اہم وجہ ٹیکس کی وصولی کا نظام ہے' جو سرتا سر رشوت' جھوٹ' دھوکہ اور ظلم و جور پر مبنی ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ٹیکس کا ایک تہائی حصہ ٹیکس افسران ہڑپ کر لیتے ہیں' ایک تہائی بزنس مین اپنے پاس رکھتا ہے' اور صرف ایک تہائی حکومت کے خزانہ تک پہنچتا ہے۔ شریف آدمی جو ایمانداری سے ٹیکس ادا کرنا چاہے وہ تو انکم ٹیکس آفیسر کے پاس اپنا صحیح گوشوارہ لے جانے سے بھی لرزتا ہے۔ ٹیکس اسلام کی رو سے ناجائز نہیں' لیکن وصولی کا یہ نظام اتنے مفاسد کا دروازہ کھولتا ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ سدباب ذریعہ کے اہم تشریعی اصول کے تحت کسی شرعی عدالت کو اسے خلافِ اسلام قرار دینے میں تامل نہ ہو گا۔

براہِ راست ٹیکس یا تو مجبور' متوسط' ملازم پیشہ طبقہ دیتا ہے' یا وہ کمپنیاں اور افراد جو کسی طرح بھی اپنی آمدنی چھپا نہیں سکتے' نہ انکم ٹیکس افسر کو راضی کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف متوسط طبقہ کا پیسہ اس سے گھسیٹا جاتا رہتا ہے۔

اس کا حل حکومت نے یہ نکالا ہے کہ طرح طرح کے بالواسطہ ٹیکس لگاؤ۔ جہاں آدمی کچھ بھی خرچ کرے وہیں ٹیکس لگا دو۔ وہ ٹیکس دیے بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنے پائے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ سانس لے تو ٹیکس دے' کھڑکی کھولے تو ٹیکس دے۔ طرح طرح کے سرچارج' اور اب سیلز ٹیکس' اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ بالواسطہ ٹیکس کا بار بظاہر امیر اور غریب پر یکساں پڑتا ہے'

لیکن غریب نقصان میں رہتا ہے' امیر فائدہ میں۔ غریب جو بالواسطہ ٹیکس دیتا ہے اس میں اس کی آمدنی کا بڑا حصہ چلا جاتا ہے۔ امیر بھی غریب کے برابر ہی دیتا ہے' جو اس کے لیے دھیلا برابر قیمت نہیں رکھتا۔ اور اس طرح بھی امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ بالواسطہ ٹیکسوں کا تناسب پہلے ہی زیادہ تھا' اس بجٹ کے نئے ٹیکسوں کے بعد یہ تناسب ۸۰ فی صد ہو جائے گا۔ بالواسطہ ٹیکسوں سے گرانی میں بے تحاشا اضافہ ہو گا۔ اس گرانی کا شکار صرف غریب اور متوسط طبقہ ہو گا۔ امیر کو کیا فرق پڑتا ہے' وہ بلا تکلف خرچ کیے چلا جائے گا۔

جب ٹیکس دینے والا خرچ کرنے والے حکمرانوں کو اس کا پیسہ اپنی شاہ خرچیوں میں بے دردی سے لٹاتے دیکھتا ہے' تو اس کا دل کس طرح ٹیکس دینے پر آمادہ ہو: مرکزی انتظامیہ پر ۲۰ ارب روپے خرچ ہوں گے' ۱۹۸۴ میں یہ ۴ ارب تھے۔ پنجاب کی انتظامیہ کا خرچ ایک سال میں ۲۰ فی صد بڑھ کر ۴ء۸ ارب ہو جائے گا' لیکن امن و امان پر' جس کے فقدان نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے' خرچ میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ۹ ماہ میں اپنے گھر اور دفاتر کی تزئین نو پر ۷۶ لاکھ روپے خرچ کر چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ نجی دوروں پر' افسران کے علاج معالجہ پر' وزرا و افسران کے مکانات' گاڑیوں اور ٹیلیفون بلوں پر' صدر پاکستان کے نجی دوروں پر' وہ امریکہ جائیں یا شکار پر' کروڑوں روپے کے خرچ اس کے سامنے ہیں۔

ہمیں امید نہیں کہ ہمارے خرچ کرنے والوں کے دلوں میں یہ خیال کبھی دور سے بھی پھٹکتا ہو گا کہ بیت المال سے خرچ کے بارہ میں اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کو یہ بتانے میں کوئی ہرج نہیں کہ مسلمان کے لیے عوام کا مال' مالِ یتیم کی طرح ہونا چاہیے۔ جو خود غنی ہے وہ نہ لے' اور جو محتاج ہے وہ بقدرِ ضرورت لے لے۔ جو یہ مال ناجائز کھاتا ہے' وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔ جن ممالک کی ترقی پر ہم فدا ہیں' ان کے ہاں بھی کوئی پبلک عہدے دار اگر سرکاری گاڑی ہی ذاتی استعمال میں لے آئے تو اسے اس کے اخراجات ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اگر لوگ ان "مغربی" اخلاقی معیارات کی عشرِ عشیر پابندی بھی دیکھیں گے تو وہ یقیناً ٹیکس دیں گے۔

جس وسیع پیمانہ پر سیلز ٹیکس لگایا گیا ہے اس سے نہ صرف عام ادمی کی زندگی اجیرن ہو جائے گی' بلکہ اس کے طریق کار میں اس کی ناکامی مضمر ہے۔ کینیڈا میں ایسے ٹیکس کے اطلاق سے پہلے لوگوں کو دو سال تربیت دی گئی تھی۔ امریکہ میں آج تک اس قسم کا نظام نافذ نہیں کیا گیا ہے۔ برطانیہ اور یورپی ممالک جیسا وی اے ٹی کا نظام ہمارے ہاں چلنا ناممکن ہے' جہاں حساب کتاب رکھنے کا کوئی رواج نہیں' بدعنوانی اور رشوت عام ہے' سو پولیس اور ٹیکس جیسے محکموں کے پاس

بھی پھٹکنے سے دور بھاگتے ہیں۔ سیلز ٹیکس ہوں ' پرانے ٹیکس جمع کرنے کے نئے طریقے ہوں' باہر سے آنے والے ہر مسافر کے سامان پر ٹیکس ہو' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ساری تدابیر صرف رشوت خوری کو آسمان تک لے جانے کا ذریعہ بنیں گی۔

مغرب کے ترقیاتی ماڈل میں زراعت کو نظر انداز کر کے' یا اس سے پیسہ کھینچ کر بھی' صنعتی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کا تصور موجود تھا۔ اس لیے ہمارے لیڈر شروع سے پسماندہ زراعتی معیشت کو چمکتی دمکتی صنعتی معیشت میں بدلنے کے لیے بے چین رہے ہیں۔ آب پاشی کا نظام تباہ ہو رہا ہے' فصلیں کاشت کرنا گراں سے گراں تر ہو رہا ہے۔ ہماری زراعت کی زبوں حالی کا اندازہ بھارتی پنجاب کی زراعت سے موازنہ کر کے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

اس بجٹ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ "انسان کی ترقی" پر' اس کی فلاح و بہبود کا اہتمام کرنے پر' اس کو اعلیٰ معیار کی زندگی سے ہم کنار کرنے کے لیے' اور اس کو تعلیم اور صحت جیسی سماجی خدمات فراہم کرنے پر وسائل لگانے سے اسی طرح مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے جس طرح ہر بجٹ میں برتی چلی آرہی ہے۔ مروجہ اور میعار و نتائج کے لحاظ سے انتہائی ناقص تعلیم اور صحت کے لیے وسائل کا تناسب اسی طرح برائے نام ہے جس طرح چلا آرہا ہے۔ ہم کو اس کی تو کوئی امید نہیں کہ ہمارے بجٹ ساز حکمرانوں کو اس بات کا احساس بھی ہو گا کہ دستور کے لحاظ سے یہ ان کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کے باشندوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لیے اگر اربوں کھربوں کے بجٹ میں ہمیں اس فریضہ کے لیے کسی رقم کا دور دور کوئی سراغ نہیں ملا تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہوا۔ (پنجاب کے ۷۲ ارب کے بجٹ میں "مذہبی امور" کے تحت ۴۴ لاکھ کی "خطیر" رقم ضرور رکھی گئی ہے)۔ ہم ان کو دین اور دستور کے لحاظ سے توجہ ضرور دلاتے لیکن بھینس کے آگے بین بجانے کا کوئی حاصل نہیں۔

ہاں' ہم اس باب میں ان کے بجٹ کا جائزہ' ترقی کی راہِ سلوک میں ان کے مرشد اور امام' ورلڈ بنک کے ارشادات کی روشنی میں لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس حوالہ سے شاید وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ بنک کی "ترقی کے چیلنج" کے عنوان سے' ورلڈ ڈیویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۱ کے مطابق' ترقی کے وہ مغربی نظریات "وقت کی کسوٹی پر ناکام ثابت ہوئے" جن کے پیچھے ہمارے حکمران اب تک دیوانے ہیں۔ (اخبار گارجین کے مطابق "ترقی کی دوڑ کے ۳۰ سال' ترقیِ معکوس کے تیس سال ثابت ہوئے")۔ چنانچہ ان نظریات میں گذشتہ ۴۰ سال میں "بنیادی تبدیلیوں کا

ایک سیلاب" امنڈ آیا ہے۔ "وہ نظریات جو کل عقلِ کُل سمجھے جاتے تھے' اور جو حکومتوں اور اداروں کے ترقی کے باب میں رہنما تھے' وہ اب اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے گئے ہیں"۔

خیال تھا کہ معاشی ترقی ہی پوری زندگی کی مکمل ترقی کا پیمانہ ہے' معلوم ہوا کہ "انسان کی ترقی" معاشی ترقی سے مختلف اور کہیں وسیع تر چیز ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات سمجھتے تھے کہ فی کس آمدنی (PCI) میں اضافہ' ترقی کے تمام دیگر پہلوؤں کے لیے سب سے اچھا پیمانہ ہے' معلوم ہوا کہ یہ پیمانہ ناکافی بھی ہے' اور فریب کار بھی' "یہ غریبوں کی بڑی بڑی آبادیوں کی فلاح و بہبود میں حقیقی تبدیلی واقع نہ ہونے پر نقاب ڈال دیتا ہے"۔ "ترقی صرف آمدنی میں اضافہ سے نہیں ناپی جا سکتی۔ اس میں' ذریعہ کے طور پر نہیں مقصد کی حیثیت میں' بہتر تعلیم' بہتر صحت کے معیار' بہتر غذا' کم غربت' پاکیزہ ماحول' مساوات' انفرادی آزادی اور لذت بخش کلچرل زندگی بھی شامل ہیں"۔ خیال تھا کہ اعداد و شمار سے سب کچھ پتا چل جاتا ہے' معلوم ہوا کہ "بنیادی ضروریات ---- غذا' تعلیم' صحت' [وغیرہ] ---- کا احاطہ اعداد و شمار کر ہی نہیں پاتے"۔ خیال تھا کہ معاشی ترقی کی کلید صنعتوں میں سرمایہ کاری ہے' معلوم ہوا کہ "اگر لوگوں (کی ترقی اور بہبود) میں سرمایہ کاری کی جائے' تو پائیدار ترقی کے لیے سب سے مضبوط بنیاد فراہم ہوتی ہے"۔ "معاشی ترقی کے لیے پیداوار میں اضافہ ضروری ہے۔ لیکن پیداوار میں اضافہ کیسے ہوتا ہے؟" اب نظریہ یہ ہے کہ تاریخ' کلچر' تعلیم' اداروں ---- سیاسی' معاشی' روایتی' خاندانی ---- اور پالیسیوں کو پورا رول دیے بغیر ٹیکنولوجیکل ترقی ممکن نہیں' اور اس کے بغیر پیداوار میں اضافہ ممکن نہیں۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی ترقی ہی ---- جس میں اس کی کلچرل ترقی شامل ہے' اور کلچر نام ہے فکر' عقیدہ' مذہب' روایات' آداب' کردار' تاریخ کا ---- کلید ہے معاشی ترقی کی۔ غربت کے ازالہ کے لیے پائیدار حکمتِ عملی کی دو بنیادیں ضروری اور اہم ہیں: ایک' غریب کے پاس جو سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے ---- یعنی اس کی محنت مزدوری ---- اس کا پیداوار کے لیے بھرپور استعمال' (نہ کہ سرمایہ کا)۔ دوسرے غریب کو تعلیم' صحت' غذا اور بہتر معیارِ زندگی کی نعمتیں فراہم کی جائیں۔ گویا طویل المیعاد تیز تر ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ترقی کا وہ نقشہ اختیار کیا جائے جس کی بنیاد انسانی محنت کے استعمال پر ہو' اور جس میں غریب کے اندر جو "انسان" ہے اس کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کیے جائیں۔

اسلام کی بات تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی' لیکن ہمارے بجٹ ساز اگر اپنے ہی ترقی اور معاشی ترقی کے اہداف کے بارہ میں سنجیدہ اور مخلص ہیں' تو پاکستان میں بسنے والے مسلمان انسان

کے عقائد، ایمان، روایات اور کلچر کی ترقی، اس کی فلاح و بہبود میں اضافہ، اس کو تعلیم، صحت، رہائش جیسی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے کثیر وسائل لگانے میں ان کی غفلت اور بخل ناقابلِ فہم بھی ہے، اور ناقابلِ تلافی جرم بھی۔ اس غفلت اور بخل پر ان کا پورا بجٹ گواہ ہے۔

اس بجٹ کو بنانے میں ہمارے حکمرانوں کی غلامانہ سوچ کا بھی دخل ہے، اس لیے کہ آغاز ہی سے ایسا ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب تو یہ "راز" ہر زبان پر ہے کہ ہماری حکومتیں اپنی معیشت کو چلانے، اپنا بجٹ بنانے، اپنے اہداف مقرر کرنے کا مکمل اختیار آئی ایم ایف کے پاس رہن رکھ چکی ہیں۔ پاکستان نے اس ادارہ کی وہ شرائط اس طرح دم ہلا کر قبول کی ہیں جس طرح دنیا کے کسی دوسرے ملک نے نہیں کیں۔ انھوں نے پنسل سے بجٹ بنایا، ہمارے بجٹ سازوں نے اسے قلم سے لکھ دیا ہے۔ وہ قرض خواہ اور سرمایہ دار ملکوں کے نمایندے ہیں۔ ان کی دلچسپی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سرمایہ اور ان کی پیداوار کے لیے منڈیاں ملیں۔ ان کے سرمایہ کے لیے ہمارا ملک پہلے ہی منڈی ہے۔ ان کو صرف یہ فکر ہے کہ قرض بمع سود ادا ہوتے رہیں۔ اور اب درآمدات پر ڈیوٹیاں بتدریج ختم کر کے ان کی پیداوار کے لیے بھی، ہمارا ملک منڈی بن جائے۔ بجٹ کی ہر شق آئی ایم ایف سے معاہدہ کے مطابق ہے۔ چنانچہ غریب پستے رہیں گے، ملک بدحال رہے گا، حکمران سنہری زنجیریں پہنے خوش خوش دادِ عیش دیتے رہیں گے۔

قوم کا مقدر یہی بجٹ رہیں گے، جو صرف قرض خواہوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہر سال نئے نئے ٹیکس لگاتے رہیں گے، جب تک کہ قوم اٹھ کھڑی نہ ہو اور اپنے تہذیبی، سیاسی اور معاشی فیصلے کرنے کا اختیار ایک "عام مسلمان" کی طرف نہ لوٹا دے۔ وہ عام مسلمان جو مغرب، امریکہ، آئی ایم ایف، اور اپنے ملک کے جاگیردار اور سرمایہ دار کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے، اور جو اپنی ترجیحات اور اقدامات کا یقین حکمرانی کے اس نظریہ پر استوار کرے جس کا اعلان حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے یوں کیا تھا:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹیکس کلکٹر نہیں، ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے"۔

---

۶۰ سال پہلے

جنوری سنہ رواں سے تین خاص رسالے جاری ہوئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ تینوں رسالے مذاق عام کے غلام نہیں ہیں۔

جاوید، دہلی: مرتب: مولوی عبد الوحید صاحب صدیقی و مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ ضخامت ۴۲ صفحات۔ سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ملنے کا پتا: نیا محل، دہلی۔

جاوید کے تین نمبر ہمارے پیش نظر ہیں۔ ہر نمبر سابقہ نمبر سے بہتر ہے۔ مضامین زیادہ تر علمی اور مذہبی ہیں۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دار العلوم دیوبند جیسے علما کی قلمی اعانت اس کو حاصل ہے۔ عام دلچسپی کے لیے کبھی ایک آدھ افسانہ کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اگر جاوید اسی مسلک پر چلتا رہا تو ہم امید کرتے ہیں کہ وہ دین اور علم کی مفید خدمت انجام دے گا۔

کونین، گورکھپور: مرتب: مولوی عزیز الرحمان صاحب اصلاحی و محمد یحییٰ صاحب اعظمی بی۔ اے۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ سالانہ چندہ ۸ عہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ کونین، کھوکھر پور، گورکھپور۔

اس رسالہ کا مقصد ایسے لوگوں کے لیے معلومات فراہم کرنا ہے "جو دنیا کے حالات سے بہت کم واقف ہیں"۔ اس لیے "زبان اور مضامین میں" ایسے ہی لوگوں کے "ذوق و رجحان کی پابندی" کی جاتی ہے۔ دینیات، سیاسیات، معاشیات، مختارات، وجدانیات، نسائیات، ادبیات، بصائر و حِکَم، تعلیم و تربیت، تاریخ و سِیَر، حوادث و ایام، عالمِ اسلام، زرعیات، اقتباسات اور معلومات اس کے مستقل عنوانات ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت مفید مضامین درج کیے جاتے ہیں۔ اس رسالہ میں ایک خاص چیز، مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر القرآن کے ایک جزو (سورۃ اللہب) کا ترجمہ ہے جو تیسرے نمبر سے شروع ہوا ہے اور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ کونین بڑا کام کرے گا، اگر مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر کے شائع شدہ اجزا کا ترجمہ شائع کرتا رہے گا۔

(سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، نقد و نظر، ج ۴، نمبر ۳، ص ۲۲۳ - ۲۲۴، ربیع الاول ۱۳۵۳، جولائی ۱۹۳۴)

حکمت عملی

آج بعض لوگ حالات کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے..... بعض اقتباسات پیش کر کے ان سے چند بالکل غلط نتائج نکال رہے ہیں..... یہ ... مضامین جن کا وہ حوالہ دیتے ہیں' ۱۹۴۰ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت بحث یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کی لا دینی قومی جمہوری ریاست تو وجود میں آگئی ہے' اب اسے اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کیسے کیا جائے۔ بلکہ یہ بحث تھی کہ ہم دارالکفر میں رہتے ہوئے ایک اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کس طرح کریں۔ (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل: ص ۱۱۰-۱۱۱)

... جو لوگ اس تحریک کے درمیانی مراحل میں آئے ہیں' یا آئندہ آئیں گے وہ اسے صرف اس کے لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کے سامنے وہ حالات نہ ہوں گے جن میں مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے یہ لٹریچر پیدا ہوتا رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی خاص دور کی لکھی ہوئی کسی عبارت سے کوئی شخص الٹے معنی برآمد کر بیٹھے اور الجھنوں میں مبتلا ہو جائے۔ حالانکہ ایک تحریک کے لٹریچر کو ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے وہ حالات بھی آدمی کی نگاہ میں ہوں جن میں وہ لکھا گیا تھا۔ (حوالہ مذکور' ص ۸۴)

... فطری طریق انقلاب کا یہ تصور کہ وہ کوئی ایسا لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے' سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔ (حوالہ مذکور' ص ۱۵۸)

(ایک بندہ خدا)

(اشتہار)

انتخابات کے ذریعہ تبدیلی

تبدیلیٔ قیادت کا واحد راستہ

ہم انتخابات سے بے تعلق بہرحال نہیں رہ سکتے' خواہ ان میں بلاواسطہ حصہ لیں یا بالواسطہ یا دونوں طرح' البتہ یہ امر کہ ہمیں کس وقت' کس طرح' یا کس کس طرح ان میں حصہ لینا ہے' جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ پر چھوڑ دینا چاہیے' تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔

انتخابات [کے] معاملے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں:

پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی و جمہوری نظام قائم ہے' اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے --- انتخابات۔

تیسری یہ کہ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلیٔ قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں' اور اسی بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔...

اس کی تکمیل کے لیے آپ کو دس بیس ہی سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ امید کرنا غلط ہے کہ کسی وقت بھی آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ انتخابات کے میدان میں اترتے ہی آپ کا پہلا

قدم آخری منزل پر پڑے۔ ...

اس کے جواب میں جو باتیں کہی جاتی ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ موجودہ بگڑے ہوئے معاشرے میں انتخابات کے ذریعہ سے تبدیلیٔ قیادت کی کوشش کرنا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ آپ کو پہلے معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے' تاکہ اس میں صالح نظام کی پیاس اور صالح لوگوں کی طلب اور ان کو تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ انتخابات میں ایسے لوگ کامیاب ہوں جو اسلامی نظامِ زندگی برپا کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور برسرِاقتدار آ کر وہ اس مقصد کے لیے عملاً کچھ کر بھی سکیں۔ ورنہ اگر معاشرہ یہی رہے جس کے بگاڑ کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں' تو محض انتخابات کے ذریعہ سے ایک صالح قیادت کا ابھر آنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس لیے صحیح ترتیبِ کار یہ ہے کہ ہم ایک مدت تک انتخابات کے میدان میں اترنے سے پرہیز کریں' اور اپنی تمام مساعی صرف اصلاحِ معاشرہ کے لیے وقف رکھیں۔ پھر جب یہ اطمینان ہو جائے کہ معاشرے میں ایک صالح قیادت کی مانگ اور اسے ابھارنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے' تب انتخابات میں حصہ لیں' کیونکہ وہی اس کا صحیح وقت ہوگا۔

بظاہر یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ساری بنیاد چند غلط مفروضات پر رکھی گئی ہے' اور پھر ان مفروضات سے ایک غلط نتیجہ نکال کر جو ترتیبِ کار تجویز کی گئی ہے وہ عقلی اور عملی دونوں پہلوؤں سے نہایت خام ہے۔

پہلی غلط بات جو اس میں فرض کی گئی ہے' یہ ہے کہ یہاں کوئی شخص اصلاحِ معاشرہ کا کام چھوڑ کر صرف انتخابات کے ذریعہ سے تبدیلی قیادت کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات امرِ واقعہ کے خلاف ہے۔ ہم جس لائحہ عمل پر برسوں سے کام کر رہے ہیں... اس کے چار میں سے تین اجزا اصلاحِ معاشرہ ہی کی تدابیر پر مشتمل ہیں۔ یہ ہمارا دائمی پروگرام ہے جس پر ہمیں سال کے تین سو پینسٹھ دن کام کرنا ہے' خواہ انتخابات ہوں یا نہ ہوں۔ اس لیے یہاں اصل بحث یہ نہیں ہے کہ آیا تبدیلیٔ قیادت کے لیے اصلاحِ معاشرہ کا کام کیا جائے یا صرف انتخابات لڑے جائیں۔ بلکہ بحث دراصل یہ ہے کہ آیا اصلاحِ معاشرہ کی یہ ساری کوشش جاری رکھنے کے ساتھ انتخابات میں بھی حصہ لیا جائے یا نہیں۔ ہماری سکیم یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہونے چاہئیں۔ ..

دوسری غلط بات اس میں یہ فرض کی گئی ہے کہ انتخاب صرف ووٹ لینے اور دینے کا کام

ہے' معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ دراصل معاشرے کو بنانے اور بگاڑنے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے' اور کوئی ایسا شخص جو "اصلاح معاشرہ" کا محض لفظ ہی نہیں بلکہ اس کے معنی بھی جانتا ہو' ان اثرات کو نظرانداز نہیں کرسکتا جو انتخابات سے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جس ملک کے نظامِ انتخابات میں رائے دہندگئ بالغان کا اصول رائج ہو' وہاں تو ووٹر اور معاشرہ درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں' کیونکہ معاشرے کا ہربالغ شخص اس میں ووٹر ہوتا ہے' ان ووٹروں سے اگر روپے کے عوض ووٹ خریدے جائیں' یا طرح طرح کے دباؤ ڈال کر' یا لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کیے جائیں' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے گردوپیش ایک ضمیر فروش' لالچی اور ڈرپو معاشرہ تیار ہو رہا ہے' اور ساتھ کے ساتھ اسی معاشرے میں ان دلالوں' غنڈوں اور بدکردار طالبینِ اقتدار کی تربیت بھی ہو رہی ہے جو اپنی قوم کی ان اخلاقی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے ہوں۔ دوسری طرف اگر ان ووٹروں سے برادریوں اور قبیلوں اور صوبوں کے نام پر بھی ووٹ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے معاشرے کو تنگ نظری' جاہلانہ تعصب اور افتراق و انتشار کی تربیت بھی دی جا رہی ہے' اور اس کے ساتھ آپ ہی کی قوم کے کچھ ذہین اور بااثر عناصر کو یہ تعلیم مل رہی ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کے لیے وہ یہ ہتھکنڈے استعمال کریں۔ تیسری طرف اگر ان ووٹروں سے روٹی اور کپڑے کے نام پر' معاشی مفادات کے نام پر' یا کچھ دوسرے لادینی اصولوں اور نظریات کی تبلیغ کرکے بھی ووٹ لیے جائیں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پورے معاشرے کو' اس کے ایک ایک بالغ مرد اور عورت کو' مادہ پرستی' دنیا پرستی' اور لادینی نظریۂ حیات کے حق میں رائے دینے کے لیے بھی تیار کیا جارہا ہے۔

انتخابات میں یہ تینوں قسم کے عناصر معاشرے کے اندر سے اپنا اپنا حصہ لیں گے اور انتخابات کا نتیجہ ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر آپ کو بتا دے گا کہ ان میں سے ہر ایک نے اس کو کس قدر بگاڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان عناصر کو اس تخریبِ معاشرہ کے لیے کھلی چھٹی دے دینا اور یہ کہنا کہ ہم تو انتخابات کو چھوڑ کر صرف اصلاحِ معاشرہ کریں گے' آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

ووٹروں کو صحیح انتخابات کے لیے تیار کرنا اصلاحِ معاشرہ کا سب سے بڑا کام ہے

پھر اصلاحِ معاشرہ سے اگر آپ کی مراد معاشرے کو اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے تیار کرنا ہے تو ووٹر کو صحیح انتخابات کے لیے تیار کرنا اس کے دائرہ عمل سے خارج کیسے ہو سکتا

ہے؟ اور یہ کام کیے بغیر کس طرح ممکن ہے کہ آپ کا معاشرہ کبھی فاسد قیادتوں کو ہٹا کر کوئی صالح قیادت برپا کرنے کے قابل ہو سکے؟ آپ کو اس کے لیے ووٹر کی اخلاقی قدریں بدلنی ہوں گی' اسے اسلامی نظام سے روشناس کرانا ہوگا' اس میں اسلامی نظام کی طلب پیدا کرنی ہوگی' اس کو صالح اور غیر صالح کی تمیز دینی ہوگی' اس کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ اس ملک کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار براہ راست وہ خود ہے۔ اس میں اتنی اخلاقی طاقت اور سمجھ بوجھ پیدا کرنی ہوگی کہ نہ دھن کے عوض اپنا ووٹ بیچے' نہ دھونس میں آکر اپنے ضمیر کے خلاف کسی کو ووٹ دے' نہ دھوکا دینے والوں کے دھوکے میں آئے' اور نہ دھاندلیوں سے بد دل ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ یہی کام تو ہم انتخابات میں حصہ لے کر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اصلاحِ معاشرہ کا کام نہیں ہے؟...

انتخابات اصلاحِ معاشرہ کا صرف ذریعہ ہی نہیں' اس کا پیمانہ بھی ہیں

تیسری ایک غلط بات اس تجویز میں اور بھی فرض کی گئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ ہم انتخابات سے الگ اصلاحِ معاشرہ کا کام کرتے ہوئے کسی خاص مرحلے پر پہنچ کر بآسانی یہ معلوم کرلیں گے کہ اب ہمارے معاشرے میں صالح قیادت برپا کرنے کی خواہش اور صلاحیت پیدا ہو چکی ہے' اور اس علم کی بنا پر ہم اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کرسکیں گے کہ انتخابات میں حصہ لینے کا صحیح وقت آگیا ہے۔

میرے نزدیک یہ محض ایک خوش فہمی ہے جو معاملات کو نہایت سطحی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو لاحق ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کا نمازی' پرہیزگار' صحیح العقیدہ' اور اصلاح پسند ہو جانا اور چیز ہے' اور ان کا عملاً اس ارادے میں مضبوط ہو جانا کہ فیصلے کے وقت ہر تعصب' ہر لالچ' ہر خوف' اور ہر فریب سے غیر متاثر رہ کر اپنا وزن اسلامی نظام کے پلڑے میں ڈالیں گے' بالکل ہی ایک دوسری چیز۔ پہلی نوعیت کی عام اصلاح آپ جتنی چاہیں اور جتنے بڑے پیمانے پر چاہیں کرتے رہیں' مگر یہ بات کہ فی الواقع کتنے لوگوں نے اس فیصلہ کن حد تک اصلاح قبول کی ہے' صرف فیصلے کے وقت ہی معلوم ہو سکتی ہے' اور وہ فیصلے کا وقت انتخابات کے موقع پر ہی آتا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو ہر چند سال کے بعد معاشرے کے ذہن و اخلاق کی حقیقی حالت اور اس کی بھلائی اور برائی کا ایک ایک پہلو ناپ کر دکھا دیتا ہے۔

(تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۰۵ - ۲۱۳)

فہمِ قرآن، تفاسیر کی روشنی میں

ڈاکٹر احسان الحق

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الحجرات ۴۹ : ۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔

مفاتیح الغیب: فخرالدین رازیؒ

یہاں ایک مومن کا دوسرے مومن کے ساتھ باہمی تعلق واضح کیا گیا ہے۔ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے یا حاضر ہو گا یا غائب۔ اگر وہ حاضر ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس کا مذاق نہ اڑایا جائے، اور اس کے ساتھ خلاف ادب رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ اس آیت میں تین الفاظ بالترتیب بیان کیے گئے ہیں: سخریہ، لمز اور نبز۔

سخریہ (تمسخر) یہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کو احترام کی نظر سے نہ دیکھے، اور اس کو اس کے مرتبہ سے گرائے۔ اس مقصد کے لیے اس کے عیوب کا ذکر ضروری نہیں ہوتا۔ اس لیے بعض لوگ، جب ان کے کسی مخالف کا ذکر ان کی مجلس میں ہوتا ہے، تو کہتے ہیں کہ "وہ بھی کوئی آدمی

ہے"۔ ہدایتِ الٰہی یہ ہے کہ اپنے بھائی کو حقیر نہ جانو اور نہ اسے چھوٹا سمجھو۔

لمز کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا عیب اس کی غیر موجودگی میں بیان کرے۔ یہ عمل پہلے کے مقابلہ میں نسبتاً کم درجے کا ہے۔ کیونکہ تمسخر میں ایک انسان دوسرے انسان کو قابلِ التفات ہی نہیں سمجھتا، بلکہ وہ اس کو ایک کھلونا بنا دیتا ہے۔ جب کہ لمز میں وہ اس کی عیب جوئی کرتا ہے۔

نبز (برے القاب سے پکارنا) لمز سے کم درجے کی چیز ہے، کیونکہ اس میں کہنے والا اپنے مقابل کو ایسی بری صفت سے متصف قرار دیتا ہے، جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔... مراد ایسے برے القاب ہیں جن سے سننے والے کو اذیت یا تکلیف ہوتی ہے۔

ان آیات میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں۔

مردوں اور عورتوں کے لیے جمع کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ تمسخر اور تکبر کا اظہار عموماً علانیہ کیا جاتا ہے۔ مردوں کا استہزا مردوں کے مجمع میں، اور عورتوں کا تمسخر عورتوں کی مجلس میں ہوتا ہے۔

عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ ارشاد فرما کر اس گناہ کی کراہت کو واضح کیا گیا ہے۔ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، اور جس کی منزلت کو کم کیا جا رہا ہے، اس کے درجات فوراً اللہ تعالیٰ بلند فرما دیتے ہیں۔... لہٰذا جو انسان کسی کو اس کے فقر کی وجہ سے یا کمزور ہونے کی بنا پر حقیر جانے گا، وہ خود بھی فقر، تنہائی اور بے چارگی کے خطرات سے محفوظ نہیں ہو گا۔

لمز میں اَنْفُسَکُمْ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک انسان کی عیب جوئی خود اس پر لوٹتی ہے، گویا وہ اپنے آپ کو عیب لگا رہا ہے۔ عیب جو اپنے عمل سے اس برائی کا دروازہ کھولتا ہے جس کی زد میں وہ خود بھی آتا ہے۔ گویا وہ دوسروں کو اکساتا ہے کہ اس کی اس حرکت کا جواب دیا جائے۔ چنانچہ اس کی عیب جوئی خود بخود شروع ہو جاتی ہے۔...

لَا تَنَابَزُوْا مشارکت کا صیغہ ہے، جب کہ لمز کے لیے لَا تَلْمِزُوْٓا ہی فرمایا۔ کیونکہ عیب جو فوراً ہی کسی کے عیب کو تلاش نہیں کر پاتا بلکہ وہ کھوج میں لگا رہتا ہے کہ کوئی عیب اس کے ہاتھ آجائے۔ جب کہ نبز (لقب دینا) نسبتاً آسان ہے۔ اگر آپ کسی کو گدھا کہیں گے، تو وہ فوراً آپ کو بیل کہہ دے گا۔

ایمان کے بعد فسق کی شہرت کتنی ناپسندیدہ ہے: یہ ان تمام برائیوں کے ارتکاب کی انتہائی مذمت ہے، یعنی کتنے افسوس کا مقام ہے کہ کوئی مومن ایمان کا مرتبہ پا لینے کے بعد ان فاسقانہ

اعمال کے ارتکاب کی شہرت پا جائے۔

جو کوئی ان اعمال کی سنگینی پر مطلع ہونے کے بعد بھی توبہ نہ کرے گا وہ ظالم ہے: اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص ان اعمال کو صغائر گردان کر ان پر اصرار کرے گا وہ ظالم ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تمسخر و استہزا، عیب جوئی اور برے القاب سے ایک دوسرے کو پکارنے سے آیندہ کے لیے بچا جائے، اور ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس پر سچے دل سے توبہ اور اظہارِ ندامت کیا جائے۔

روح المعانی: محمود آلوسیؒ

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ: بعض کے نزدیک سخریہ کا مفہوم کسی شخص کی اس کی موجودگی میں ہنسی اڑانا ہے۔...

اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ اس لیے کہا کہ مومنوں کی مثال نفسِ واحدہ کی ہے۔ جب ایک مومن دوسرے مومن کی عیب جوئی کرتا ہے، گویا وہ اپنی عیب جوئی کرتا ہے۔... سخریہ سے مراد کسی شخص کی اس کے سامنے ہنسی اڑاتے ہوئے توہین کرنا اور لمز سے مراد اس کے عیوب پر مطلع کرنا ہے، چاہے وہ اس میں موجود ہوں یا نہ ہوں، ہنسی اڑانے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ گویا دوسروں کی عیب جوئی کر کے اپنی عیب جوئی کا دروازہ نہ کھولو۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کبیرہ گناہوں میں یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے"۔ اور اس کی تشریح آپؐ نے یوں فرمائی "اگر وہ دوسروں کے والدین کو گالی دے گا، دوسرے بھی اس کے والدین کو گالی دیں گے"۔

نبز مذمت کے لیے خاص ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ علما کا اتفاق ہے کہ کسی انسان کو ایسے لقب سے پکارنا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو، یا اس کے ماں باپ کی طرف کوئی ناپسندیدہ نسبت کر کے پکارنا حرام ہے۔...

فرمایا، ایمان اور فسق جمع نہیں ہو سکتے۔ یہاں فسق سے مراد برے القاب سے پکارنا ہے۔ ان القاب سے وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو بظاہر قبیح ہوں، لیکن ان سے مقصد کسی کو ایذا پہنچانا یا کسی کی شان کم کرنا نہیں ہے۔

الجامع لاحکام القرآن: محمد بن احمد قرطبیؒ

ہو سکتا ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ زیادہ صاف ضمیر اور دل کا پاک ہو، اور مذاق اڑانے والا اس شخص کی تحقیر کے ظلم کا مرتکب ہو رہا ہو جسے اللہ نے معزز بنایا۔ عمرو بن شرجیل

کا قول ہے کہ اگر میں کسی کو دیکھوں کہ وہ بکری کے بچے کو دودھ پلا رہا ہے اور میں اس کا مذاق اڑاؤں تو مجھے ڈر ہے کہ میں خود بھی وہی کچھ نہ کروں جو اس نے کیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت صفیہؓ کے بارے میں ہاتھ سے ان کے چھوٹے قد کی طرف اشارہ کیا' تو آپؐ نے فرمایا' کہ تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر سمندر اس سے آلودہ کیا جائے تو وہ آلودہ ہو جائے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ لمز ہاتھ' آنکھ' زبان اور اشارہ سے ہوتا ہے۔ اور ھمز صرف زبان سے ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: "تم میں ایک شخص اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتا ہے' لیکن اپنی آنکھ کے شہتیر کو چھوڑ دیتا ہے"۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے: آدمی اگر عقلمند اور ڈرنے والا ہو' تو اس کا ورع (احتیاط) اور اپنے عیوب پر نظر' اسے دوسرے کے عیوب سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ جس طرح ایک بیمار کے درد' اسے تمام لوگوں کے درد اور تکالیف سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔...

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تنابز بالالقاب سے باز آنے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کی سابقہ گناہ آلود زندگی پر عار نہ دلائی جائے' جب کہ وہ سچے دل سے توبہ کر چکا ہو۔ آپؐ نے فرمایا: "جس نے کسی مومن کو اس کے توبہ کردہ گناہ پر عار دلائی تو اللہ پر واجب ہے کہ وہ اس کو (اسی گناہ) میں مبتلا کرے اور اسے دنیا و آخرت میں رسوا کرے"۔

معارف القرآن: مفتی محمد شفیعؒ

سورہ حجرات کے شروع میں نبی کریمؐ کے حقوق اور آداب کا بیان آیا۔ پھر عام مسلمانوں کے باہمی حقوق و آداب معاشرت کا بیان شروع ہوا' سابقہ دو آیتوں میں ان کی اجتماعی و جماعتی اصلاح کے احکام بیان ہوئے' مذکور الصدر آیتوں میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آداب معاشرت کا ذکر ہے۔...

سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا اس طرح ذکر کرنا ہے کہ اس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بہ نصِ قرآن حرام ہیں۔... حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزا کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں۔...

لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں۔... علما نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے' ان کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے۔ جو ایسا کرے گا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفر نے خوب فرمایا ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو جہان میں کوئی برا نہ رہا

تدبر قرآن : امین احسن اصلاحی

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے، اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو، لیکن قیامت کے دن کھلے کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرکلہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہلِ دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی، قیامت کے دن پتا چلے کہ خدا کی بادشاہی میں جو مقام اس کا ہے وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔...

لمز کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اس پر کوئی طنز آمیز فقرہ چست کر دینا ہے۔... اس قسم کے زہر آلود فقرے قائل کے حسد کی بھی غمازی کرتے ہیں اور اس کے تکبر و غرور کی بھی اور ان کا اثر دوسروں پر یا تو حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا نفرت و عناد کی صورت میں، اور یہ دونوں ہی چیزیں معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والی ہیں۔

اچھے القاب سے ملقب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے اسی طرح برے القاب کسی پر چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجویہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور ان کا اثر نہایت دور رس اور نہایت پائیدار ہوتا ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں۔ اور اگر معاشرے میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے برے القاب ایجاد کرنے پر لگا دیں تو پھر اس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اس کے وحدت لازماً پارہ پارہ ہو کر رہتی ہے۔...

بِئسَ اور نِعمَ کے اندر فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ٹھیک معنی خیز ترجمہ یہ ہو گا کہ "نہایت ہی برا لفظ ہے فسق ایمان کے بعد"۔...

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے یہ سب فسق میں داخل ہیں اور اہلِ ایمان کی حسِ ایمانی اتنی بیدار ہونی چاہیے کہ ارتکابِ فسق تو درکنار لفظِ فسق سے بھی وہ نفور و بیزار ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہہ ہے جو اس وضاحت کے بعد بھی اس قسم کے کسی فسق کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں سے

توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ظالم وہی ٹھہریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے ایمان کی برکتیں بھی واضح کر دی ہیں اور ان کو کفر و فسق کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے وہ اس کے نتائج سے لازماً دوچار ہوں گے' اور یہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہو گا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

تفہیم القرآن : سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ضروری ہدایات دینے کے بعد' اہلِ ایمان کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ دین کے مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں' اور ان کو خدا سے ڈرتے ہوئے اپنے آپس کے تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب آگے کی دو آیتوں میں ان بڑی بڑی برائیوں کے سدِ باب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر حملہ' ایک دوسرے کی دل آزاری' ایک دوسرے سے بدگمانی اور ایک دوسرے کے عیوب کا تجسس' درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جن سے آپس کی عداوتیں پیدا ہوتی ہیں' اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر ان سے بڑے بڑے فتنے رونما ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں جو احکام آگے کی آیتوں میں دیے گئے ہیں' اور ان کی جو تشریحات احادیث میں ملتی ہیں' ان کی بنا پر ایک مفصل قانونِ ہتکِ عزت (Law of libel) مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مغربی قوانینِ ہتکِ عزت اس معاملے میں اتنے ناقص ہیں کہ ایک شخص ان کے تحت دعویٰ کر کے اپنی عزت کچھ اور کھو آتا ہے۔ اسلامی قانون اس کے برعکس ہر شخص کی ایک بنیادی عزت کا قائل ہے جس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

مذاق اڑانے سے مراد محض زبان ہی سے کسی کا مذاق اڑانا نہیں ہے' بلکہ کسی کی نقل اتارنا' اس کی طرف اشارے کرنا' اور اس کی بات پر یا اس کے کام یا اس کی صورت یا اس کے لباس پر ہنسنا' یا اس کے کسی نقص یا عیب کی طرف لوگوں کو اس طرح توجہ دلانا کہ دوسرے اس پر ہنسیں' یہ سب بھی مذاق اڑانے میں داخل ہیں۔ اصل ممانعت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی کسی نہ کسی طور پر تضحیک کرے' کیونکہ اس تضحیک میں لازماً اپنی بڑائی اور دوسرے کی تذلیل و تحقیر کے جذبات کار فرما ہوتے ہیں جو اخلاقاً سخت معیوب ہیں' اور مزید برآں اس سے دوسرے شخص کی دل آزاری بھی ہوتی ہے جس سے معاشرے میں فساد رونما ہوتا ہے۔

اسی بنا پر اس فعل کو حرام کیا گیا ہے۔

مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے لیے عورتوں کا مذاق اڑانا یا عورتوں کے لیے مردوں کا مذاق اڑانا جائز ہے۔ دراصل جس وجہ سے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام سرے سے مخلوط سوسائٹی ہی کا قائل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی تضحیک عموماً بے تکلف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے، اور اسلام میں یہ گنجائش رکھی ہی نہیں گئی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔ اس لیے اس بات کو ایک مسلم معاشرے میں قابلِ تصور نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک مجلس میں مرد کسی عورت کا مذاق اڑائیں گے یا عورتیں کسی مرد کا مذاق اڑائیں گی۔

لفظ لمز استعمال ہوا ہے جس کے اندر طعن و تشنیع کے علاوہ متعدد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں، مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب چینی کرنا، اور کھلم کھلا یا زیرِ لب یا اشاروں سے کسی کو نشانۂ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال بھی چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑتے ہیں اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں اس لیے ان کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی کی بلاغت یہ ہے کہ لَا يَلْمِزْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (ایک دوسرے پر طعن نہ کرو) کہنے کی بجائے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنے اوپر طعن نہ کرو) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں، جن سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرنے والا دراصل خود اپنے آپ کو مطعون کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کی زبان دوسروں کے خلاف بدگوئی کے لیے اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک اس کے دل میں برے جذبات کا لاوا خوب پک کر پھوٹ پڑنے کے لیے تیار نہ ہو گیا ہو۔ اس طرح ان جذبات کی پرورش کرنے والا دوسروں سے پہلے اپنے نفس کو تو بدی کا آشیانہ بنا چکتا ہے۔ پھر جب وہ دوسروں پر چوٹ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر چوٹیں کرنے کے لیے دوسروں کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی شرافت کی بنا پر اس کے حملوں کو ٹال جائے۔ مگر اس نے تو اپنی طرف سے یہ دروازہ کھول ہی دیا کہ وہ شخص بھی اس پر حملہ آور ہو جس کو اس نے اپنی زبان کے تیروں کا ہدف بنایا ہے۔

لَا تَنَابَزُوْا کے حکم کا منشا یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے نام سے نہ پکارا جائے یا ایسا لقب نہ دیا جائے جو اس کو ناگوار ہو اور جس سے اس کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کو فاسق یا منافق کہنا، کسی کو لنگڑا یا اندھا یا کانا کہنا۔ کسی کو اس کے اپنے یا اس کے ماں باپ یا خاندان کے کسی عیب یا نقص سے ملقّب کرنا۔ کسی کو مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے سابق مذہب کی بنا پر

یہودی یا نصرانی کہنا۔ کسی شخص یا خاندان یا برادری یا گروہ کا ایسا نام رکھ دینا جو اس کی مذمت اور تذلیل کا پہلو رکھتا ہو۔ اس حکم سے صرف وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے تو بدنما ہیں مگر ان سے مذمت مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ ان لوگوں کی پہچان کا ذریعہ بن جاتے ہیں جن کو ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر محدثین نے اسماء الرجال میں سلیمان الاعمش (چندھے سلیمان) اور واصل الاحدب (کبڑے واصل) جیسے القاب کو جائز رکھا ہے۔ ایک نام کے کئی آدمی موجود ہوں اور ان میں سے کسی خاص شخص کی پہچان اس کے کسی خاص لقب ہی سے ہوتی ہو تو وہ لقب استعمال کیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ بجائے خود برا ہو۔ مثلاً عبداللہ نام کے کئی آدمی ہوں اور ایک ان میں سے نابینا ہو تو آپ اس کی پہچان کے لیے نابینا عبداللہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے القاب بھی اس حکم کے تحت نہیں آتے جن میں بظاہر تنقیص کا پہلو نکلتا ہے مگر درحقیقت وہ محبت کی بنا پر رکھے جاتے ہیں اور خود وہ لوگ بھی جنھیں ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے، انھیں پسند کرتے ہیں، جیسے ابو ہریرہ اور ابو تراب۔

ایک مومن کے لیے یہ بات سخت شرمناک ہے کہ مومن ہونے کے باوجود بدزبانی اور شہد پن میں نام پیدا کرے۔ ایک کافر اگر اس لحاظ سے مشہور ہو کہ وہ لوگوں کا مذاق خوب اڑاتا ہے، یا پھبتیاں خوب کستا ہے، یا برے برے نام خوب تجویز کرتا ہے، تو یہ انسانیت کے لحاظ سے خواہ اچھی شہرت نہ ہو کم از کم اس کے کفر کو تو زیب دیتی ہے۔ مگر ایک آدمی اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد ایسے ذلیل اوصاف میں شہرت حاصل کرے تو یہ ڈوب مرنے کے لائق بات ہے۔

(تفاسیر سے اقتباسات کی تلخیص و تدوین کی گئی ہے)

تزکیہ وتربیت

وقت کی قدر کیجیے' یہ بڑی دولت ہے

محمد بشیر جمعہ

دولت اور وقت دونوں انسان کے لیے نعمتیں ہیں۔ دولت ظاہری چیز ہے' یہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملتی ہے۔ لیکن ہر انسان جسے زندگی کا ایک دن ملتا ہے اسے چوبیس گھنٹے ملتے ہیں' اور یہ چوبیس گھنٹے ہر انسان کو مساوی طور پر ملتے ہیں۔ مگر اسے یہ گھنٹے نظر نہیں آتے۔

نیشا غورث نے کہا ہے کہ "انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے۔ لیکن اگر وقت کو بہتر طریقہ پر صَرف کرے تو گھنٹوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہو جاتا ہے"۔ ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ "انسان کو ہر وقت وہ بات سیکھنی چاہیے جس کے نہ جاننے سے اسے شرمندگی ہو"۔ حسن البنا الشہید فرماتے ہیں کہ "وقت سونا ہے' یہ بات ان لوگوں کے نقطہ نظر سے صحیح ہے جو ہر چیز کو مادیت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ لیکن وقت ان لوگوں کے لیے زندگی ہے جن کی نگاہیں اس سے بہت آگے تک دیکھتی ہیں۔ دانشمند لوگ اس بات کی توفیق مانگتے ہیں کہ ہر کام اپنے صحیح وقت پر سرانجام پائے"۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں' وقت تلوار کی طرح ہے۔ حکما کا قول ہے کہ "زمانہ سیال ہے' اسے کسی آن سکون نہیں"۔ خدا فرماتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت ہے مگر انسان موت کا وقت نہیں جانتا۔ انبیائے کرام بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وقت سے ہوشیار رہو' وقت کی خبر رکھو' وقت کو برباد نہ کرو' وقت کو غیر مفید باتوں میں صَرف نہ کرو۔ گھڑی گھڑی لحظہ لحظہ کا تمھیں حساب دینا پڑے گا۔ صدیوں کا تجربہ بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ دنیا میں جس قدر کامران و کامیاب ہستیاں گزری ہیں' ان کی کامیابی و ناموری کا راز سب سے بڑھ کر وقت کی قدر و قیمت اور اس کا صحیح استعمال تھا۔

سورہ عصر کی تشریح میں امام شافعیؒ نے وقت اور زمانے کے گزر جانے کی تمثیل برف

فروخت کرنے والے سے دی' جس کی برف مسلسل پگھل رہی ہے۔ اگر لوگ خرید لیتے ہیں تو وہ کما لیتا ہے' ورنہ نقصان اٹھاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز کسی شخص کے قدم اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہلیں گے جب تک اللہ تعالیٰ اس سے یہ نہ پوچھ لے کہ اس نے اپنی عمر اور جوانی کو کہاں صَرف کیا' جو علم تھا اس پر کتنا عمل کیا' اور مال کن ذرائع سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ دعا کیا کرتے تھے کہ "اے اللہ' ہمیں کبھی اندھیرے میں نہ رہنے دے' ہماری کوتاہیوں پر ہمیں نہ پکڑ اور ہمیں وقت سے لاپروائی والا نہ بنا"۔ "حضرت عمر فاروقؓ دعا کیا کرتے تھے کہ "اے اللہ' میرے لیے اوقات میں برکت فرما اور انھیں صحیح مصرف میں لانے کی توفیق دے"۔ حضرت جنید بغدادیؒ وقت اور احتساب کے بارے میں فرماتے تھے کہ تم ہر لمحہ یہ دیکھتے رہو کہ اللہ سے کتنے قریب ہوئے' شیطان سے کتنے دور ہوئے' جنت سے کتنے قریب ہوئے اور دوزخ سے کتنے دور ہوئے۔

تضیعِ اوقات

ہمارے ہاں تضیعِ اوقات کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی نفسیات سے ہے' اور دوسری کا تعلق ہمارے معاشرے سے ہے۔ اشارات کے ذریعے ہم تضیعِ اوقات کی مختلف صورتیں واضح کرتے ہیں۔

۱- ہر کام خود کرنے اور ہر چیز کا تجربہ کرنے کا مزاج تضیعِ اوقات کا باعث ہوتا ہے۔ ہر کسی سے کچھ سیکھنا چاہیے اور دوسروں کے تجربات اور صلاحیتوں سے مدد لینی چاہیے۔

۲- مقبول بننے کے لیے ہر کام کرنے کا ناقابلِ عمل شوق بھی تضیعِ اوقات کا باعث ہوتا ہے۔ جو کام کر سکتے ہیں اس کا وعدہ کرنا چاہیے' ورنہ معذرت کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۳- لوگ اکملیت اور کمال کے شوقین ہوتے ہیں' اور اس شوق میں وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ انسان کو زندگی کے لیے جو اگلا لمحہ ملا ہے' وہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی کا مشن اپنی تکمیل کو نہیں پہنچا' پھر ہم اپنے کاموں کو اکملیت کے رجحان کی وجہ سے کیوں ادھورا چھوڑ دیں۔

۴- بغیر مقصد' بغیر صلاحیت اور بغیر سمجھے کام کرنے سے بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔

۵- طبیعت میں سستی' ٹال مٹول اور موخر کرنے کی عادت تضیعِ اوقات کا بہت بڑا باعث ہے۔

۶- اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ کل کر لیں گے۔ یہ ایک دھوکا ہے۔ داناؤں کی لغت میں کل

کا لفظ کبھی نہیں ملتا۔ البتہ بے وقوفوں کی جنتریوں میں یہ کثرت سے ملتا ہے۔ یہ خیالی پلاؤ پکانے والوں کا سہارا ہے۔ کامیابی کی شاہراہ پر بے شمار اپاہج سسکتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنی عمر "کل" کا تعاقب کرتے ہوئے کھو دی' اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی ہے۔ ہم اس دھوکے میں ہاتھ پیر دھرے بیٹھے رہے کہ "کل" ہمارے لیے اچھی اچھی نعمتیں اور فائدہ مند اشیا لائے گا' مگر اس کل کا ہمیشہ انتظار ہی رہے گا۔

۷ - تضیعِ اوقات کا ایک اور سبب کاموں کو ادھورا چھوڑ دینا ہے۔ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ کن حالات میں اور کتنے وقت میں اس کام کو کرنا ہے۔ اسے چاہیے کہ اس لحاظ سے پروگرام بنائے' ایک وقت میں ایک کام کو مکمل کرے۔

۸ - اپنی ذات میں تنظیم کی کمی' اپنے جذبات پر قدرت کی کمی' اور گرد و پیش اور ماحول کو سمجھنے کی صلاحیت کی کمی' بھی تضیعِ اوقات کا باعث ہوتی ہے۔

۹ - معاملات پر مناسب توجہ نہ ہونا اور کسی کام کو کروانے کے لیے پیچھے نہ پڑنا' بھی تضیعِ اوقات کا باعث ہوتا ہے۔

۱۰ - ہر ملنے والا فرد دوست نہیں ہوتا' اور نہ ہی ہر فرد کو اس کے اطمینان کی حد تک وقت دینا درست ہے۔

۱۱ - گھروں اور دفتروں کے درمیان میلوں اور گھنٹوں کے فاصلے انسان کے وقت کو بہت ضائع کرتے ہیں۔

۱۲ - ہمارے ہاں کی دعوتیں بھی عموماً چار سے پانچ گھنٹے لے لیتی ہیں' اور پھر مہمانوں کے دیر سے آنے کا فیشن بھی تضیعِ اوقات کی وجہ بنتا ہے۔

۱۳ - دفاتر میں تقسیمِ کار کی' اور افراد کی کمی' اور افراد کو ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں علم نہ ہونے' کے باعث وقت کافی ضائع ہوتا ہے۔ اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہ ہونا' اور مناسب دیکھ بھال کی کمی' ان اداروں میں سیاست کا باعث ہوتی ہے۔ یہ رفتہ رفتہ پورے ادارے کی کارکردگی تباہ کر دیتی ہے۔ مگر اس پر غور و خوض کا کوئی معقول بندوبست کہیں بھی نظر نہیں آتا' جس سے مزید وقت ضائع ہوتا ہے۔

۱۴ - سفارشی افراد صرف کام چلانے کے لیے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہوتے ہیں' جس سے اداروں کا بڑا وقت ضائع ہوتا ہے۔ دوسری طرف اہل افراد کی بھی ہمت شکنی اور ناقدری ہوتی ہے۔

۱۵ - ہمارے سرکاری دفاتر میں طریقہ کار کی پیچیدگیاں' سرکاری افراد کی گپ شپ' اور اجتماعی چائے پینے کے مواقع ضیاعِ وقت کے اہم اسباب ہیں۔ سرکاری اہلکاروں کے یومیہ لاکھوں گھنٹے غیر پیداواری کاموں میں صَرف ہو جاتے ہیں اور عوام ٹیکس تلے دبتے جاتے ہیں۔

۱۶ - کرکٹ جیسے اشغال میں بھی ہماری قوم لاکھوں گھنٹے ضائع کرتی ہے۔

۱۷ - ایڈ ہاک ازم اور بحران پیدا کر کے کام کرنے کا مزاج بھی اہل افراد کے لیے تضیعِ اوقات کا باعث ہوتا ہے' وقت اور اہلیت کی قدر ضروری ہے۔

۱۸ - فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی کمی اور ذمہ داری لینے کے حوصلہ کی کمی بھی بہت سے کاموں کو ٹال دیتی ہے۔

۱۹ - کاغذی کارروائی اور فائل بھی اس قوم کی ترقی پر بند باندھ رہی ہے۔

۲۰ - حاضری اور کارکردگی کے شعور کی کمی بھی معاملات کو الجھا دیتی ہے۔

۲۱ - افراد کی تربیت نہ کرنا اور انھیں آیندہ کے کاموں کے لیے تیار نہ کرنا بھی اداروں کے اجتماعی اوقات کو ضائع کرتا ہے۔

۲۲ - ٹیلی فون کا غیر ضروری استعمال یا ضروری استعمال جس میں غیر ضروری باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ دوست احباب اور گھر والوں کے فون' اور ان کی فرمایش' اور پھر بحث' یہ تمام تضیعِ اوقات کا باعث ہوتی ہے۔ فون بڑے کام کی اہم چیز ہے' موسم یا فیشن کی بحث کے لیے اس کا استعمال نقصان کے مترادف ہے۔

۲۳ - اگر ہم اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کرتے اور محض دفتر کی حاضری کے لیے کام کرتے ہیں تو ہم اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکیں گے۔

کیا آپ وقت ضائع کرنے والوں میں سے ہیں؟

کسی بھی شخصیت میں درج ذیل علامتوں میں سے ایک یا ایک سے زائد پائی جائیں گی تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ شخصیت وقت کے استعمال کا صحیح شعور نہیں رکھتی۔ اسے اپنا جائزہ لینا ہو گا تاکہ وہ آیندہ بہتر طور پر آگے بڑھ سکے۔

۱ - کبھی بھی اہم امور کو نمٹانے کا وقت نہ ملنا۔

۲ - فوری نوعیت کے امور پر زیادہ وقت صَرف کر دینا اور اہم تر کاموں کو مؤخر کرتے رہنا۔

۳ - دفتر میں دیر تک بیکار بیٹھے رہنا۔ حالانکہ وقت پر جا سکتے ہیں' کام وقت پر ختم کر سکتے ہیں' اور وقت کی پابندی ہو سکتی ہے۔

۴ - دفتر کے کام کو گھر لے جانا۔ یہ بھی وقت ضائع کرنے کے ذیل میں آتا ہے کیونکہ گھر دفتر نہیں ہے۔

۵ - کاغذی کارروائی اور کاغذات کے معاملات میں ٹال مٹول کرنا' اور تحریر کرنے کے لیے مناسب وقت اور موڈ کا انتظار کرنا۔

۶ - دوسروں کے کام کرتے رہنا اور اس میں خوشی محسوس کرنا' اپنے کاموں کے لیے بہانے تلاش کرتے رہنا۔

۷ - یہ احساس کہ ہم ناگزیر ہیں اور ہمارے بغیر ادارہ نہیں چل سکتا۔

۸ - میٹنگوں اور کانفرنسوں میں بہت زیادہ شرکت کرنا اور اپنے آپ کو تعلقاتِ عامہ کا چیمپئن سمجھنا۔

۹ - معذرت کرنے میں تکلف سے کام لینا' حالانکہ معذرت کی جا سکتی ہو۔

۱۰ - عموماً زیرِ دباؤ رہنا' پریشان رہنا اور وقت کی کمی کا شکار رہنا۔

۱۱ - صحیح وقت پر کام ختم نہ کرنا۔

۱۲ - بجلی' گیس' ٹیلی فون بل' لائسنس فیس وغیرہ صحیح وقت پر ادا نہ کرنا۔ گاڑی اور اسکوٹر میں پیٹرول' آئل اور پانی ختم ہو جانا۔ بچوں اور اہلِ خانہ کو بیماری کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے وقت نہ ملنا۔

دفتر اور کاروباری اوقات کا ضیاع

سعودی عرب کی ایک مسجد میں خطبۂ جمعہ کے دوران الشیخ زہرانی نے کہا تھا: "آج میں آپ سے کام کے بارے میں گفتگو کروں گا: وہ عام کام جو ہم ملازمت کی صورت میں کرتے ہیں۔ اگر ہم مسلم امتہ کی طرف نظر دوڑائیں تو ہمیں ایک بڑا فاصلہ نظر آتا ہے' کام کی اس نوعیت میں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور جو حقیقتاً ہم اپنے دفاتر میں انجام دے رہے ہیں"۔ بعض حضرات اس کو کافی سمجھتے ہیں کہ وہ وقت پر دفتر آتے ہیں اور وقت پر گھر لوٹ جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے کہ یہ دیکھیں کہ ان دفتری اوقات میں ان کی کارکردگی کیسی رہی۔ کیا وہ زیادہ سے زیادہ پیداواری صلاحیت بروئے کار لائے' یا انھوں نے وقت کا ایک بڑا حصہ گپ شپ' غیر متعلق کاموں اور دیگر فضول مشاغل میں ضائع کر دیا کہ یہ ایک طرح کی خیانت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قیمتی وقت اور اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیتوں کا بھی ضیاع ہے۔

وقت کے بہتر استعمال کے لیے چند تجاویز

ایک عربی مقولہ ہے' جس کا مطلب ہے کہ جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور کوشش بھی کرتا ہے وہ اندر داخل ہو جاتا ہے۔ آپ بھی وقت کے بہتر استعمال کے ذریعہ کامیاب زندگی کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کر دیجیے۔ چند تجاویز ہیں' ان کے ذریعہ دروازہ کھولنے کی کوشش بھی کیجیے۔ آپ کا رب شانِ کریمی سے آپ کی اس کوشش سے نکلنے والے پسینے کے قطروں کو موتی بنا دے گا۔

۱۔ فوری طور پر ان مشغلوں کی فہرست تیار کیجیے جہاں آپ کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ سوچیے اور ایسے کاموں کو لکھ لیجیے۔

۲۔ جو کام آپ کے کرنے کے نہیں ہیں مگر آپ کر رہے ہیں ان کی بھی فہرست بنائیے۔

۳۔ جو کام دوسرے کر سکتے ہیں وہ آپ خود کر رہے ہیں حالانکہ وہ دوسروں کو تفویض کیے جا سکتے ہیں۔ انھیں بھی تحریر کیجیے۔

۴۔ اس کے علاوہ اپنے غیر تکمیل شدہ کاموں کی فہرست تیار کیجیے۔

۵۔ مگر اس سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ میں آپ کی زندگی کے نصب العین کا شعور ہو۔ آپ کے پاس اس کی قلیل المیعاد اور طویل المیعاد منصوبہ بندی ہو' اس صورت میں آپ کے وقت کی افادیت زیادہ ہو گی۔

۶۔ اس کے علاوہ نفسیاتی طور پر موثر بننے کی کوشش کیجیے۔

۷۔ حاضری اور کارکردگی کے فرق کو سمجھیے' اور اس کے مطابق اپنی استعداد بڑھائیے۔ کم وقت میں بہتر طریقے استعمال کر کے زیادہ موثر کام کرنے کی کوشش کیجیے۔ سر والٹر اسکاٹ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "ہوشیار رہو! اپنے دل میں کوئی ایسی رغبت پیدا نہ ہونے دو جو تمیں وقت رایگاں کرنے والا بنا دے۔ جو کرنا ہے اسے فوراً کر ڈالو۔ کام کے بعد آرام کی خواہش دل میں آنے دو"۔ وقت' نصب العین' محنت' استقلال' مستعدی اور احتساب آپ کو چند روز میں شاہراہ کامیابی پر لے آئیں گے۔

۸۔ ہم آپ کو کوئی چارٹ تجویز نہیں کر رہے۔ کاغذ کے ٹکڑے یا کارڈز لے لیجیے۔ ان پر اوپر دیے ہوئے کاموں کی الگ الگ فہرست بنا لیجیے۔ ایک اور فہرست بنائیے ان کاموں کی جو آپ اس ہفتے میں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری' ان کی جو اس مہینہ میں' اور تیسری' ان کی جو اس سال میں ختم کرنا چاہتے ہیں۔

۹ - نصب العین اور مقصد زندگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یومیہ کاموں کی فہرست بنایئے۔ ان کی ترجیحات تحریر کیجیے‘ انھیں بہتر طور پر انجام دینے کے لیے وقت اور فاصلے کا ربط پیشِ نظر رکھیے۔ ہر کام کو ٹارگٹ اور ڈیڈ لائن دیجیے۔ دن میں مختلف وقفوں کے ساتھ اس فہرست کا جائزہ لیتے رہیے‘ جہاں ضروری ہو وہاں سرجری بھی کیجیے۔

۱۰ - اپنی ٹیم کی تشکیل کیجیے‘ ان کی تربیت کا اہتمام کیجیے۔ ان کے اختیارات اور ذمہ داریاں متعین کیجیے‘ اور پھر انھیں کام تفویض کیجیے۔ ان کاموں کا جائزہ لیجیے اور پھر ان کی اصلاح کیجیے۔ حوصلہ افزائی کیجیے‘ تعریف کیجیے‘ ترقی دیجیے اور ان کی حقیقی معنوں میں قدر کیجیے کہ وہ آپ کے لیے "خزانہ" ہیں۔

۱۱ - اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان عوامل کا پتہ لگایئے جو وقت کے نقصان کا باعث ہیں۔ جن کے ذمہ دار آپ ہیں وہ آپ خود دور کیجیے۔ باقی کے لیے آپ مینجمنٹ کے پاس جایئے۔ شروع میں تکلیف ہو گی مگر آپ یہ تو سوچیے کہ اس کے ذریعہ آپ نہ صرف اپنا‘ اپنے مالک کا‘ اپنے ادارے کا‘ بلکہ ملک و قوم کا فائدہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح آپ کا ہی فائدہ ہو گا‘ کیونکہ آپ اچھائی کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

۱۲ - اپنے بہترین وقت کا پتا لگایئے جب آپ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بس ان اوقات میں انتہائی اہم کاموں کو کرنے کی کوشش کیجیے‘ تاکہ ان کا انجام بھی اچھا ہو۔

۱۳ - اہم اور فوری کاموں کی تفریق کر لیجیے۔ اہم کام زیادہ توجہ طلب ہیں۔ فوری کام رہنمائی کے بعد تفویض ہو سکتے ہیں۔

۱۴ - ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی عادت ڈالیے۔ اس کے لیے آپ کو اپنے کاموں کی فہرست مختصر کرنی پڑے گی اور کئی کام دوسروں کو تفویض کرنے پڑیں گے۔

۱۵ - آمدورفت اور انتظار کے وقت کو بہتر طور پر استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کیجیے۔

۱۶ - ٹیلی فون کا بہتر استعمال سیکھنے کی کوشش کیجیے۔ "السلام علیکم" میں خیریت اور دعائیں شامل ہیں۔ مزید حال اور واقعات کے لیے ٹیلی فون کو استعمال نہ کیجیے۔

۱۷ - دفتر کو دفتر ہی میں چھوڑ کر آیئے‘ گھر کو دفتر نہ بنایئے۔

۱۸ - افراد سے ملاقاتوں کے اوقات طے کر لیجیے۔ عموماً مخصوص اوقات ملاقاتوں کے لیے دیجیے۔ آپ کو بھی ان اوقات کا علم اور ملاقاتیوں کو بھی احساس ہو۔ کھانے کی دعوتوں پر غیر ضروری گفتگو زیادہ ہوتی ہے اور کام کی گفتگو کم۔ اس کی افادیت کو پیشِ نظر رکھیے۔

۱۹ - پیغام کی پرچیوں کا بہتر استعمال کریں۔ جو کام پیغام سے ہو سکتا ہے اس کے لیے بلانے اور خود جانے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح آنے جانے میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔

۲۰ - دفتر کے اوقات اگر صبح ۹ تا ۵ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ۹ بجے کام شروع اور ۵ بجے ختم کریں۔ لوگ ان اوقات کو صرف آنے اور روانہ ہونے کا وقت سمجھتے ہیں۔

۲۱ - ٹال مٹول یا موخر کرنا۔ یہ انسانی زندگی کی ترقی میں وہی کردار ادا کرتی ہے جو کہ عام صحت کے لیے کینسر اور تپ دق۔ کاموں کو لے کر بیٹھ جانا اور ان پر فیصلہ نہ کرنا، سوچتے رہنا اور کچھ نہ کرنا، ایسے کاموں سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ:

- ☆ آپ اسے ایک شدید نقصان دہ عادت اور اپنا دشمن نمبرایک تصور کریں۔
- ☆ ٹال مٹول کی عادتوں کی فہرست تیار کیجیے، اور اس کے خلاف نفسیاتی مہم شروع کیجیے۔
- ☆ ترجیحات متعین کیجیے اور اس کے مطابق کام کیجیے۔
- ☆ وقت متعین کیجیے اور اس میں کام ختم کرنے کی کوشش کیجیے۔
- ☆ مشکل کاموں کو ایک طرف مت کیجیے بلکہ چیلنج سمجھتے ہوئے کیجیے، انجام دیجیے۔

حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپؐ نے ابو امامہؓ سے پوچھا، کیا بات ہے میں تمہیں مسجد میں اوقاتِ نماز کے علاوہ بھی دیکھتا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فکریں اور کچھ قرضے ہیں جو مجھ سے چمٹے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں جو اگر تم پڑھنا شروع کر دو تو اللہ تعالیٰ تمہاری فکر کو بھی دور فرما دے اور قرض بھی ادا کر دے۔ انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ ضرور بتایئے۔ آپؐ نے فرمایا، صبح و شام یہ پڑھ لیا کرو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الھم والحُزنِ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ العَجزِ و الکَسَلِ، وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِن ضَلَعِ الدَّیْنِ وَ قَھرِ الرِّجَالِ۔

"اے اللہ میں فکر و غم سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ بے چارگی اور کاہلی سے تیری پناہ میں آتا ہوں، بخل اور بزدلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور قرض کے غلبے اور لوگوں کے تسلط سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

ابو امامہؓ بتاتے ہیں، جب میں نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے میری فکر بھی دور فرمادی اور میرا قرض بھی ادا کر دیا۔

مقروض انسان ادائیگیِ قرض میں عموماً رقم ہونے کے باوجود تاخیر کرتا ہے۔ یہی نفسیاتی بیماری عام طور پر کاموں سے نمٹنے میں بھی ہوتی ہے۔ یعنی وقت، صلاحیت اور وسائل کے باوجود ہم تاخیر

کرتے ہیں۔ پس مندرجہ بالا دعا باقاعدگی سے کرنے کے ساتھ ساتھ' قوت عمل بھی پیدا کیجیے اور کاموں کا نمٹانے کی کوشش کیجیے۔اپنے آپ پر جبر کیجیے اور "ابھی اور فوراً" کا فارمولا اپنایئے۔

۲۲ - ایک عادت یہ ہے کہ کچھ کام نہ ہوتے ہوئے بھی مصروفیت ظاہر کی جائے۔ یہ حضرات اپنے میز کو فائلوں سے بھرا رکھتے ہیں۔ اس غلط تصور سے چھٹکارا حاصل کیجیے۔ بلکہ کام کو نمٹانے میں خوشی اور قابلیت محسوس کیجیے۔

۲۳ - فوری طور پر ردِّعمل کی عادت کو ترک کیجیے۔ غصہ میں مت آیئے۔ بلکہ صحیح چیز پر' صحیح وقت اور صحیح طریقے پر غصہ کرنا سیکھیے۔ چہرہ سرخ تو جب چاہیں کر سکتے ہیں' مگر گرمی کو برداشت کرنا بہرحال ایک زیادہ بڑا کام ہے۔

۲۴ - پوری لگن کے ساتھ کیجیے۔ مگر کام کے دوران وقفہ بھی لیجیے۔

۲۵ - لوگوں سے مسکرا کر بات کیجیے۔ لوگوں کی باتوں کو بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ مت لیجیے۔

۲۶ - ہر کام کو اپنے اوپر سوار نہ کیجیے۔

۲۷ - اپنے فارغ اوقات کو بہتر طور پر استعمال کیجیے۔ مطالعہ کتب' اخبارات و رسائل' تعلیمِ بالغاں' دینی تعلیم' محلّہ کے مسائل' مسجد' دعوت و تبلیغ' کھیل کود اور تربیتِ ذات کی طرف بھی توجہ دیجیے۔

لوارے کیا کریں

۱ - وہ اپنے ملازمین کے اوقات کو اس انداز سے ترتیب دیں کہ ان کا وقت ضائع نہ ہو۔

۲ - وہ اپنے ملازمین کو ان کی ذمہ داریوں اور اختیارات کے بارے میں بتائیں۔ بلکہ کاموں کی واضح تقسیم اور تشریح ہونی چاہیے۔

۳ - وہ افراد و ادارے کے درمیان گفت و شنید اور رابطہ کے طریقہ کار کو بہتر اور پر مسرت بنائیں۔

۴ - ذمہ دار حکام کو چاہیے کہ وہ اداروں کے نااہل افراد کی جانب سے کھیلی جانے والی سیاست کا تدارک کریں' اور باصلاحیت افراد کو ان کی صلاحیت کے مطابق کام دیں اور ترقی دیں۔ ذمہ داران اس سلسلے میں انفرادی ملاقاتوں کا بھی اہتمام کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اداروں میں ٹیم ورک پیدا ہو گا اور کارکردگی میں اضافہ ہو گا کیونکہ رابطہ کی سہولت کے باعث کارکنوں کا اعتماد مستحکم ہوتا ہے۔

یہ دعا مانگیے

میرا رب سب عیبوں سے پاک ہے، بلند، اور سب سے برتر، اور سب سے زیادہ دینے والا ہے۔ میں پناہ لیتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے ان کلمات کی جو مکمل و کافی ہیں (ان میں کوئی نقصان نہیں)، اس کی تمام پیدا کردہ مخلوق کے شر سے۔ اس کے نام کی برکت سے، جس کے نام سے نہ زمین پر کوئی چیز نقصان پہنچائے نہ آسمان میں، اور وہ خوب سننے والا اور اچھی طرح جاننے والا ہے، صبح کی ہم، اس حالت میں کہ ساری بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس وہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ساری بادشاہت اسی کی ہے، اور سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اے رب، میں تجھ سے وہ بھلائی جو اس دن میں ہے، اور جو اس کے بعد ہے، وہ سب مانگتا ہوں، اور جو برائی اس دن میں ہے، اور جو اس کے بعد ہے، اس سب سے تیری پناہ لیتا ہوں اے رب، میں تیری پناہ لیتا ہوں کاہلی سے اور سخت بڑھاپے سے۔

اے رب، میں تیری پناہ لیتا ہوں قبر کے عذاب سے، دوزخ کے عذاب سے۔

ان دعاؤں کو صبح کے اوقات میں پڑھنا یقیناً بہتر دن گزارنے کا باعث ہوگا، دعا ہے کہ ہم وقت، صلاحیت، ذمہ داری اور حقوق کے قدر کرنے والے بن جائیں۔ آمین

طلبِ اذن کی اہمیت

ڈاکٹر شہزا کوثر چیمہ

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو مکمل معاشرتی نظام دیا ہے اور ہر قسم کے آداب سکھائے ہیں۔ انھی آداب میں' گھروں میں داخل ہونے سے قبل' اذن یعنی اجازت طلب کرنے کے آداب بھی شامل ہیں۔ یہ لازمی قرار دیا گیا کہ مسلمان ایک دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہوں۔بغیر اجازت داخل نہ ہونے کی اصل حکمت فرد کی ذاتی زندگی کی اور گھر کے تخلیہ کی حفاظت ہے۔ کسی فرد اور گھر میں رہنے والوں کو یہ تحفظ حاصل ہونا چاہیے کہ کوئی ان کی زندگی میں بلا اطلاع و اجازت تانک جھانک نہ کرے' اور اندر نہ آ دھمکے۔

قرآنی ہدایت

"جاہلیت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ **حییتم صباحًا حییتم مساء** (صبح بخیر' شام بخیر) کہتے ہوئے بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے' اور بسا اوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نازیبا حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیہ کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیہ میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلل انداز ہو" (تفہیم القرآن' جلد سوم' صفحہ ۳۷۶۔۳۷۷)۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اے ایمان والو! تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو' جب تک کہ (ان سے) اجازت حاصل نہ کر لو اور (اجازت لینے سے قبل) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔... (یہ بات تم کو اس لیے بتلائی گئی ہے) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو)۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو (مختارِ اذن کی جانب سے) اجازت نہ دی جائے اور اگر تم سے (اجازت لینے کے

وقت) یہ کہہ دیا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو لوٹ آیا کرو۔ یہی بات تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے (اگر خلاف کرو گے تو سزا کے مستحق ہو گے)۔ تم کو ایسے مکانات میں چلے جانے کا گناہ نہ ہو گا' جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو۔ ان میں تمہارے کچھ مال و متاع ہوں اور تم جو کچھ اعلانیہ کرتے ہو اور جو پوشیدہ طور پر کرتے ہو' اللہ تو سب جانتا ہے۔ (سورۃ النور ۲۴' ۲۷' ۲۸' ۲۹)

مندرجہ بالا آیات میں جن "آداب" کا حکم عطا ہوا ہے ان میں مصلحت یہ ہے کہ معاشرے میں برائی رونما نہ ہو سکے اور صلح اور سکون ہو۔ جہاں معاشرہ صالح ہو گا وہاں تمدن بھی شائستہ ہو گا۔ چنانچہ قرآن پاک نے ان اسباب کے سدباب کے لیے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے جو معاشرے کی اخلاقی فضا کو مکدر کر دیتے ہیں۔

اجازت کا مسنون طریقہ

اجازت حاصل کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ انسان کو جس گھر میں جانا مقصود ہے' وہاں پہنچ کر گھر والوں کو سلام کرے' اپنا نام بتائے' گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق مروی ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے: "السلام علیکم' یا رسول اللہ" کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

ابتدا میں جب استیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ربعیؒ سے روایت ہے' بنی عامر کے ایک مرد نے نبی کریمؐ سے اس وقت اجازت طلب کی جب کہ وہ گھر میں داخل ہو چکا تھا' اور کہا' کیا میں داخل ہو جاؤں؟ نبی کریمؐ نے اپنے خادم سے کہا' اس شخص کے پاس جاؤ اور اجازت طلب کرنا سکھاؤ' اور کہو کہ السلام علیکم کہہ کر اجازت لینا چاہیے کہ کیا میں داخل ہو جاؤں؟ اس آدمی نے حضورؐ کا فرمان سن لیا اور کہا' السلام علیکم' پھر کہا' کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ نبی کریمؐ نے اس کو اجازت دی تو وہ داخل ہوا۔ (بذل المجہود' ج ۶' ص ۳۱۷)

جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرتؐ کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے عرض کیا "میں ہوں!" آپؐ نے دو مرتبہ فرمایا "میں ہوں' میں ہوں" (یعنی اس "میں ہوں" سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو)۔ گویا کہ آپؐ نے اسے ناپسند فرمایا۔ "کلدہ بن حنبل سے روایت ہے کہ ان کو صفوان بن امیہؓ نے دودھ' ہرن کا بچہ اور کچھ لکڑیوں کے ساتھ رسول اللہؐ کے پاس بھیجا تو نبی کریمؐ مکہ کے بالائی حصے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام نہیں کیا اور داخل ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا' لوٹ جاؤ اور

السلام علیکم کہو۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت صفوان اسلام لا چکے تھے۔ (ابو داؤد' کتاب الادب' باب الاستیذان)

تخلیہ کے حق کا اطلاق

گھر خواہ اہلِ خانہ کی ملکیت ہو' یا اس نے کرایہ پر حاصل کیا ہو' یا وہ عاریتاً اس میں گزر بسر کرتا ہو' خواہ اس گھر میں محرم ہوں یا غیر محرم' مرد رہتے ہوں یا عورتیں' تمام صورتوں میں جو صاحبِ خانہ ہے' اس سے اجازت لینی چاہیے۔ گھر والا اجازت دے یا اس نے جس کو اجازت دینے کا اختیار دیا ہے' وہ اجازت دے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

○ وہ مکان جو خاص اپنے رہنے کا ہو اور جس میں دوسرے آدمی کے آنے کا احتمال نہیں' اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس میں کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں' کیونکہ وجوبِ استیذان کی علت اس میں موجود نہیں ہے۔

○ جس مکان میں کوئی اور بھی رہتا ہو' خواہ وہ محارم ہی کیوں نہ ہو' یا جہاں کسی اور کے آ جانے کا بھی احتمال ہو' اس قسم کے متعلق حکم ہے کہ خواہ لوگ ان گھروں میں بطور مِلک کے' یا بطور عاریت کے' یا اجارہ کے رہتے ہوں' ان میں مت داخل ہو' جب تک کہ ان سے اجازت حاصل نہ کرو۔ یہ حکم استیذان مردانہ و زنانہ سب گھروں کے لیے ہے۔ استیذان واجب ہے اور تقدیمِ سلام سنت ہے۔... وہ مکان بھی اس سے مستثنیٰ ہے جہاں اس غرض سے بیٹھا ہو کہ جس کا دل چاہے ملنے کو آوے۔ جو مکان خلوت اور آرام کے لیے مخصوص ہے' گو مردانہ ہی ہو' یا ملاقات کا مکان خلوت خانہ بن جائے' کسی اور قرائن سے معلوم ہو جاوے' وہاں استیذان کی حاجت ہو گی۔ (بیان القرآن' ج ۸' ص ۱۳)

○ جس میں کہ بالفعل رہنے یا نہ رہنے دونوں کا احتمال ہو۔

○ وہ گھر جس میں کسی کی خاص سکونت متعین نہ ہو جیسے مدرسہ' خانقاہ اور سرائے وغیرہ۔

اگرچہ یہاں خطاب مردوں کو ہے لیکن عورتوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

حضورؐ نے تخلیہ کے اس حق کو صرف گھروں میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا' جس کی رو سے دوسروں کے گھروں میں جھانکنا' باہر سے نگاہ ڈالنا' حتیٰ کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ (تفہیم القرآن' جلد سوم' ص ۳۷۶-۳۷۷)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، "جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط پر نظر دوڑائی اس نے گویا آگ میں جھانکا۔" (حافظ المنذری، مختصر سنن ابی داؤد)

دروازے پر کھڑے ہونے کے آداب

رہبرِ مدنیت رسولِ مقبولؐ نے اپنے قول و فعل سے اس بات کی ہدایت فرمائی ہے کہ اجازت طلب کرنے والے کو دروازے کے عین سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔

حضرت ہذیل بن شرجیلؒ کہتے ہیں، ایک شخص نبی کریمؐ کے ہاں حاضر ہوا، اور عین دروازے پر کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا۔ حضورؐ نے اسے فرمایا: "پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اس لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے" (بذل المجہود، ج ۲، ص ۳۱۷)۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جب نگاہ داخل ہو گئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا۔" (ایضاً، ص ۳۱۶)

حضورؐ کا اپنا قاعدہ مبارک بھی یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے۔ آپؐ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے۔

آنحضورؐ نے اس شخص کو بھی تنبیہہ فرمائی ہے جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں جھانکے۔ حضرت انسؓ خادمِ رسولؐ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضورؐ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپؐ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے۔ (صحیح بخاری)

تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں (ج ۳، ص ۲۷۹)۔ ایک اور حدیث میں ہے: جس نے کسی کے گھر میں جھانکا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ مواخذہ نہیں۔ (جصاص، احکام القرآن، جلد ۳، ص ۳۸۵)

امام شافعیؒ اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ اجازت محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھس آئے اور گھر والوں کے

روکنے پر وہ باز نہ آئے' اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کشمکش اور مزاحمت میں اس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

فقہا نے نگاہ ہی کے حکم میں سماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی' مگر اس کے کان گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیہ کے حق میں بے جا مداخلت ہے۔

اپنے گھر میں داخل ہونا

اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی ہی صورت میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبیؐ سے پوچھا: "کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں"۔ آپؐ نے فرمایا: "ہاں۔" اس نے کہا: "میرے سوا اس کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں"۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟" حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے: "اپنی ماں' بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ " (تفسیر ابن کثیر' ج ۳' ص ۲۸)۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ ان کی بیوی زینبؓ کی روایت ہے کہ جب وہ کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آ رہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں۔ (ابن کثیر' ج ۳' ص ۲۸۰)

استثنائی صورت

سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی کے گھر اچانک کوئی مصیبت آ جائے' مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور گھس آئے۔ ایسے واقعہ پر مدد کے لیے بلا اجازت اندر جا سکتے ہیں۔ ایسے گھروں اور جگہوں میں جہاں لوگوں کے لیے داخلے کی عام اجازت ہو' مثلاً ہوٹل' سرائے' مہمان خانے' دوکانیں' مسافرخانے وغیرہ وغیرہ' وہاں داخل ہونے کے لیے اذن طلب کرنا ضروری نہیں۔ (تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۷۸-۳۷۹)۔

طلبِ اجازت کی حد

اجازت لینے کے لیے حضورؐ نے زیادہ سے زیادہ تین بار پکارنے کی حد مقرر کر دی' اور فرمایا کہ "اگر تیسری بار پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ۔" (صحیح بخاری)

حضورؐ کا اپنا یہی طریقہ تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عبادہ کے ہاں گئے' اور السلام علیکم کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی' مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت سعدؓ اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ" میں آپؐ کی آواز سن رہا تھا' مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے۔ اس لیے بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا۔" (بذل المجہود' ج ۶' ص ۳۱۹)

سیّد مودودیؒ لکھتے ہیں: یہ تین بار پکارنا پے درپے نہ ہونا چاہیے' بلکہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پکارنا چاہیے تاکہ صاحبِ خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

اجازت یا تو صاحبِ خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے' مثلاً گھر کا خادم' یا اور کوئی ذمہ دار قسم کا مرد اور اگر چھوٹا بچہ کہہ دے کہ آ جاؤ تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہونا چاہیے۔ (تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۷۸)

اجازت طلب کرنے میں اصرار نہ کرنا چاہیے' کیونکہ ازروئے قرآن اس بات کی اجازت نہیں دی گئی۔ بلکہ "سورہ النور" کی متعلقہ آیت کے الفاظ واضح طور پر یہی بتاتے ہیں کہ اگر تمہیں کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو "واپس ہو جاؤ"۔ اس پر عمل کرنا چاہیے تاکہ آپس کے تعلقات بگڑنے نہ پائیں۔

آدابِ استیذان کے فوائد

فرد کی ذاتی زندگی اور اس کے تخلیہ کے حق کے تحفظ' اخلاق کی پاکیزگی اور نفس کی طہارت کے لیے دوسرے کے گھر اور پرائیویٹ زندگی میں داخل ہونے سے قبل اذن حاصل کرنا بہت لازمی امر ہے۔ استیذان کے متعلق جتنے آداب کا ذکر کیا گیا ہے' ان پر عمل کرنے سے یہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔

تاریخ و سِیَر

حافظ ابنِ عبد البرؒ قرطبی اندلسی

ملک عبدالرشید عراقی

حافظ ابنِ عبدالبر ابوعمر یوسف (۳۶۸ھ ۔ ۴۶۳ھ) کا شمار اندلس کے ان نامور علمائے کرام میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف اندلس بلکہ پوری دنیا کو اپنی علمی اور فکری خدمات سے متاثر کیا۔ آپ نے حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ مالکی اور موطا امام مالک کی بیش بہا خدمت کی۔

ابتدائی کوائف زندگی

آپ کا پورا نام یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبربن عاصم' کنیت ابوعمر' اور عرف ابنِ عبدالبر تھا (تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۳۲۶)۔ آپ ۲۵ ربیع الاخر ۳۶۸ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) ابنِ عبدالبر کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "میں ۲۵ ربیع الاخر ۳۶۸ھ کو جمعہ کے دن اس وقت پیدا ہوا جب امام خطبہ دے رہا تھا" (وفیات الاعیان' ج ۳' ص ۲۱۷)۔

ان کا تعلق قرطبہ سے تھا' جو اندلس کا دارالحکومت اور دنیائے اسلام کا عظیم شہر تھا۔ "حافظ ابنِ عبدالبر نمری اس لیے کہلاتے ہیں کہ آپ کا نسبی تعلق نمر بن قاسط سے ہے۔ نمر بن قاسط کی طرف جو قبیلہ منسوب ہے وہ بہت بڑا اور مشہور ہے۔" (ابنِ خلکان)

ان کے والد' عبداللہ بن محمد کا شمار قرطبہ کے اکابر علما اور فقہامیں ہوتا تھا' آپ ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا انتقال ۳۸۰ھ میں ہوا۔ اس وقت حافظ ابنِ عبدالبر کی عمر ۱۲ سال تھی۔ ۱۲ سال کی عمر کا لڑکا کتنا علم حاصل کر سکتا ہے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ حافظ ابنِ عبدالبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ (ابنِ فرحون مالکی' الدیباج المذہب' ص ۳۵۹)

تحصیلِ علم

حافظ ابنِ عبدالبر کی تعلیم و تربیت قرطبہ میں ہوئی' جہاں قرآن مجید کے جلیل القدر مفسر بھی

موجود تھے' حدیث کے شارح بھی' محقق بھی اور مورخ بھی۔ یہاں علمی و دینی اور تحقیقی مراکز بھی تھے۔ قرطبہ میں بے شمار کتب خانے تھے' جہاں فن کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کتابیں موجود تھیں جن سے شائقین استفادہ کرتے تھے۔ دنیا کے دوسرے حصوں سے بھی طلبہ تحصیلِ علم کے لیے قرطبہ کا سفر کرتے تھے۔ چنانچہ قرطبہ کو دنیا میں ایک بین الاقوامی علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی' اور یہاں کے علمائے کرام کے قول اور عمل کو پورے مغرب میں حجت اور سند سمجھا جانے لگا۔ حافظ عبدالبر نے ایسے علمی ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی' اور قرطبہ کے جلیل القدر علمائے کرام سے استفادہ کیا۔

انھوں نے اپنے دور کے جن ممتاز آئمہ سے استفادہ کیا' ان کا تذکرہ حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) اور علامہ ابنِ فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ان میں درج ذیل ممتاز شخصیات بھی شامل ہیں۔

۱۔ امام ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن (م ۳۹۰ھ): آپ نے عراق کے علما سے استفادہ کیا' اور اندلس میں حلقۂ درس قائم کیا۔ ابنِ عبدالبر نے آپ سے سنن ابوداؤد کا سماع کیا۔

۲۔ امام ابو القاسم خلف بن قاسم بن سہل بن الدباغ الاندلسی (م ۳۹۳ھ): ان کا شمار اندلس کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ ابنِ عبدالبر نے جملہ علوم اسلامیہ میں ان سے استفادہ کیا۔

۳۔ امام ابو عمر احمد بن محمد بن احمد بن سعید المعروف بابن الجسور (م ۴۰۱ھ): آپ کا شمار اندلس کے ممتاز علمائے حدیث میں ہوتا تھا۔

۴۔ امام ابو عمر احمد بن محمد بن عبداللہ الطلمنکی (م ۴۲۹ھ): آپ قرات کے امام مانے جاتے تھے۔ فنِ حدیث اور اسماء الرجال میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ حافظ ابنِ عبدالبر نے آپ سے حدیث میں استفادہ کیا۔

۵۔ امام ابو الولید سلیمان بن خلف بن سعید بن ایوب باجی قرطبی (م ۴۷۴ھ): آپ اندلس کے ممتاز عالم' نامور محدث اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ آپ کی ساری زندگی حدیث کی خدمت اور اس کی نشرواشاعت میں بسر ہوئی۔

حافظ ابنِ عبدالبر نے اپنی ساری زندگی اندلس ہی میں بسر کی۔ اندلس کے باہر کسی دوسرے ملک میں آپ کو جانے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اربابِ سِیَر اور تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ اندلس کے شرق و غرب شہروں میں آپ تشریف لے گئے۔ ابنِ خلکان لکھتے ہیں: قرطبہ چھوڑ کر حافظ ابنِ عبدالبر مغربی اندلس چلے گئے۔ پھر وہاں سے مشرقی اندلس کا سفر کیا' اور دانیہ میں سکونت

اختیار کی۔ بعد میں بلنیہ آئے اور پھر شاطبہ میں رہے۔ ملک مظفر کے عہد میں آپ کو اشبونہ اور شنترین کے قضا کا منصب دیا گیا۔

علمی مرتبہ

حافظ ابنِ عبدالبر کے علم و فضل، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت، زہد و ورع، امانت و دیانت کا علمائے کرام نے اعتراف کیا ہے۔ علامہ ابنِ فرحون مالکی لکھتے ہیں: "حافظ ابنِ عبدالبر اندلس کی سرزمین میں سنن ماثورہ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔"

حافظ ابنِ عبدالبر کو، گو تمام علومِ اسلامیہ میں علمی تبحّر حاصل تھا لیکن سب سے زیادہ اشتغال اور انہماک علمِ حدیث سے تھا، اور علمائے کرام نے حدیث میں آپ کے علمی تبحّر کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ: "حافظ ابنِ عبدالبر نے اندلس سے باہر قدم نہیں نکالا۔ تاہم حدیث میں ان کا رتبہ خطیب بغدادی، امام بیہقی اور امام ابنِ حزم جیسے اربابِ کمال اور اساطینِ فن سے کم تر نہیں تھا، بلکہ وہ بعض حیثیتوں سے ان سب میں ممتاز تھے۔ (بستان المحدثین، ص ۶۹)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں: "آپ حدیث کے حافظ تھے۔ نیز علمِ حدیث و رجال کے ممتاز عالم تھے۔ فنِ حدیث میں ایسی مہارت اور پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ متقدمین علمائے اندلس پر سبقت لے گئے اور علمِ حدیث میں تقدّم اور علمِ فقہ اور معانی میں بصیرت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ علم الانساب اور علم الاخبار میں بھی پوری طرح دسترس حاصل تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۲۲۶)

خصوصاً حافظ ابنِ عبدالبر اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے ماہر تھے، اور علمائے کرام نے ان کے اس فن میں ماہر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ: "حافظ ابنِ عبدالبر حدیث و رجال کے عالم تھے۔ ان کی سند عالی، اور وہ توثیق و تضعیف کے ماہر تھے۔" (تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۳۲۶)

حافظ ابنِ عبدالبر صرف حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور جرح و تعدیل ہی میں ممتاز نہ تھے بلکہ ان کو متعدد دوسرے علومِ اسلامیہ یعنی تفسیر، تاریخ، قرات، انساب، سِیَر و اخبار، عربی ادب اور معانی میں دستگاہ حاصل تھی۔

شعر و سخن

حافظ ابنِ عبدالبر جہاں ایک بہت بڑے محدث، فقیہہ، امامِ ادب و تاریخ، صاحبِ سِیَر و

انساب تھے وہاں آپ شعر و سخن سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے' اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے۔

فقہی مذہب

بلادِ مغرب کے اکابر و فضلا کی طرح حافظ ابنِ عبدالبر' امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کے مکتبِ فقہ و اجتہاد سے وابستہ تھے۔ آپ نے موطا امام مالک کی بیش بہا خدمت کی۔ حافظ ذہبی اور دیگر علما نے امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کے اقوال و مذاہب کی طرف ان کے میلان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مالکی تھے' اور ان میں اجتہادی بصیرت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

وفات

حافظ ابنِ عبدالبر نے ۹۵ سال کی عمر میں ربیع الاخر کی آخری تاریخ کو ۴۶۳ھ میں شاطبیہ میں انتقال کیا۔ (وفیات الاعیان' ج ۳' ص ۴۲۱)

تصنیفات

حافظ ابنِ عبدالبر قرطبی ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ ابنِ خلکان لکھتے ہیں کہ: "حافظ ابنِ عبدالبر کی تصنیف و تالیف میں توفیقِ الٰہی اور تائیدِ ایزدی ان کے شاملِ حال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے بڑا فائدہ پہنچایا"۔ (وفیات الاعیان' ج ۳' ص ۲۱۸)

حافظ ابنِ عبدالبر قرطبی کی جملہ علومِ اسلامیہ پر گہری نظر تھی' اس لیے آپ نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا' اور بڑے عمدہ انداز میں بحث کی ہے۔ اس سے ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ مختلف موضوعات پر حافظ ابنِ عبدالبر کی ۳۲ کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ تمام تصنیفات کا تعارف کرانا تو ممکن نہیں' تاہم چند مشہور تصنیفات کا مختصر تعارف کرانا بھی ضروری ہے۔ اس لیے آپ کی ۸ تصنیفات کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ **بہجتہ المجالس وانس المجالس:** اس کتاب میں آپ نے ادب و محاضرات کی بلند پایہ کتابوں سے نادر واقعات' منتخب اشعار' دلچسپ حکایات اور حکیمانہ اقوال جمع کیے ہیں۔ صاحبِ کشف الظنون حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) لکھتے ہیں: " بہجتہ المجالس کا شمار ادب کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے"۔

حافظ ابنِ عبدالبر خود بھی شعر کہتے تھے' اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو اشعار کی صورت میں وصیت کی۔ جن سے ان کے اعلیٰ ذوق اور عربی ادب سے خاص مناسبت کا

کا پتا چلتا ہے:

دنیا سے دور رہنا اور اس کو اہمیت نہ دینا۔ اور دین کے راستے کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنا۔ اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرنا۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔

اس لیے کہ تقویٰ سب سے بڑا سہارا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اور کوئی سہارا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرنا۔ اس لیے کہ شکر ادا کرنے سے مزید نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ شکر نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

وہ تمام کام چھوڑ جن کے کرنے سے کرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ صحیح راستہ پر چل' حق کا راستہ چھپا ہوا نہیں' بلکہ ظاہر اور نمایاں ہے۔

زندگی کے جو تھوڑے دن باقی ہیں' انھیں بہت احتیاط اور سوچ کے ساتھ گزار۔ اس لیے کہ یہ مختصر زندگی نہ دائمی ہے اور نہ باقی ہے۔ یعنی ختم ہونے والی ہے۔

دیکھو عمر کس طرح مسلسل گزر رہی ہے۔ اس کی جدت بوسیدہ ہو رہی ہے اور اس کی مدت فنا ہو رہی ہے۔

۲۔ **کتاب الکافی فی الفقہ اہل مدینہ مالکی**: یہ فقہ مدینہ اور مذہب مالکی کے فروع و جزئیات پر ایک مبسوط کتاب ہے۔ کتاب کی تالیف کے بارے میں حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

"مجھ سے میرے ایک بھائی نے کہا کہ میں فقہی مسائل پر ایک ایسی کتاب لکھوں جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی حیثیت کی حامل ہو' اور احکام کے سمجھنے کے سلسلے میں مفید ہو' جامع اور ترتیب کے لحاظ سے عمدہ ہو' تاکہ پڑھنے والا اسے باسانی اور خوشی خوشی پڑھ سکے۔ اور کسی لمبی اور ضخیم کتب کے مطالعے کی احتیاج نہ رہے۔ میں نے اس میں علمائے مدینہ کے علم پر اعتماد کیا ہے اور امام مالک بن انس کے مسلک کو اختیار کیا ہے"۔

یہ کتاب کتب خانہ سیدنا عثمانؓ' مدینہ منورہ میں ایک قلمی مخطوطہ کی شکل میں موجود تھی (مقالاتِ سلیمان' ج ۲'ص ۳۷۳)۔ڈاکٹر محمد احید الموریتانی کی تحقیق اور تعلیق کے ساتھ مکتبہ الریاض الحدیثہ نے اسے شائع کیا ہے۔

۳۔ **الانتقاء فی فضائل الثلاثہ الفقہاء مالک و شافعی و ابی حنیفہؒ**: یہ کتاب ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہؒ' امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے فضائل و مناقب اور اوصاف و کمالات کا مجموعہ ہے۔ ان اساطین فقہ کے تذکرہ میں ضمناً ان کے نامور تلامذہ کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ

کتاب ۱۳۵۰ھ میں مکتبہ قدسی قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکی ہے۔ (تذکرہ المحدثین' ج ۲' ص ۳۷۲)

۴۔ **جامع بیان العلم و فضلہ:** یہ ایک معروف و مشہور کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے علم' فضیلتِ علم اور علما کے فرائض پر بڑے اچھے پیرائے میں بحث کی ہے' اور حضورؐ کے ارشادات' صحابہ کرامؓ' تابعین' تبع تابعین اور دیگر جلیل القدر علمائے کرام کے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ لکھتے ہیں: "مجھ سے پہلے بھی اس قسم کی کتابیں کئی آدمی لکھ چکے ہیں۔ وہ کافی ہوتیں' تو میں یہ کتاب نہ لکھتا اور ان کی طرف اشارہ کر دیتا۔ لیکن وہ کافی نہیں۔ ہر مولف نے وہی جمع کیا ہے جو اس کے ذہن میں محفوظ تھا' اور جس کے تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا یا جسے اس نے طالبِ ارشاد کے لیے مناسب سمجھا۔"

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزادؒ (م ۱۹۵۸) کے ایما سے' ۱۹۲۷ میں اس کا اردو ترجمہ کیا۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی اور یہ جون ۱۹۵۳ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ مولانا ملیح آبادی مرحوم لکھتے ہیں کہ "علم اور فضیلتِ علم پر اس سے بہتر اور جامع کتاب نہیں دیکھی گئی۔ اسلامی نقطہ نظر سے علم' اہلِ علم اور طالبانِ علم کے بارے میں آدمی جو کچھ جاننا چاہے اس کتاب میں موجود ملے گا"۔

۵۔ **الاستذکار' بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ الموطا:** حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے موطا امام مالک کی ایک بسیط شرح "**التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید**" لکھی۔ صاحبِ کشف الظنون لکھتے ہیں کہ آپ نے ایک کتاب تمہید لکھی اور الاستذکار اس کا خلاصہ ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ موطا کی مستقل شرح ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں: "یہ موطا کی بہترین اور عمدہ شرحوں میں ہے۔ اس کے ابواب کی تنسیق میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور مختصر ہونے کی وجہ سے نہایت مقبول و متعارف ہے۔ (بستان المحدثین' ص ۱۲۰)

۶۔ **التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید:** یہ موطا امام مالک کی ضخیم' عمدہ اور عظیم الشان شرح ہے' اور موطا امام مالک کی جتنی شروح لکھی گئی ہیں ان میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اسی شرح کی بدولت حافظ ابنِ عبدالبر کو مالکیہ میں سب سے بلند محدث تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ ابنِ حزم (م ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: "فقہ الحدیث میں ایسی عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری اور اس سے بہتر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں: "حافظ ابنِ عبدالبر کی شرح تمہید' فقہ حدیث میں نادرہ روزگار کتاب ہے۔ یہ روشن ضمیر مجتہدوں

کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔ اور مذہبِ مالکی کے متعلق تنہا یہی کتاب کافی ہے"۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ اپنی اس شرح کو بہت پسند کرتے تھے' فرماتے ہیں: "یہ کتاب ۳۰ سال سے میرے دل کی مونس اور ساتھی ہے' میرے ذہن کی صفائی کا ذریعہ اور میرے غموں کو دور کرنے کا وسیلہ۔ میں نے اس میں لوگوں کے لیے ان کے نبیؐ کے کلام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے معانی و مطالب اور نکات کی وضاحت کی ہے۔ اس میں ایسے آداب ہیں جن کے اپنانے سے نیکی اور تقویٰ حاصل ہوتا ہے' اور ظلم سے دور رہنے کی توفیق ملتی ہے"۔

۷۔ **الاستیعاب فی معرفتہ الاصحاب:** حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے اس کتاب میں ۳۵۸۵ صحابہ کرامؓ کے حالات و مناقب اور فضائل بیان کیے ہیں۔ کتاب بہت عمدہ' عظیم الشان اور معلومات سے پُر ہے۔ اس کتاب کو مغرب کے علاوہ مشرق میں بھی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس سے پہلے بھی صحابہ کرامؓ کے حالات و مناقب پر محدثینِ کرام نے کتابیں لکھیں۔ مگر حافظ ابنِ عبدالبر کی کتاب الاستیعاب کو ایک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی (م ۸۵۲ ھ) لکھتے ہیں: "حافظ ابنِ عبدالبر نے اپنی کتاب کا نام الاستیعاب اس لیے رکھا' کہ آپ اس موضوع پر اسے گذشتہ کتب کی جامع سمجھتے تھے۔ لیکن آپ کا یہ خیال صحیح نہیں۔ بہت کچھ آپ سے چھوٹ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں ابوبکر بن فتحون اور دیگر علماءِ کرام نے اس کتاب پر ضمیمے لکھے۔"

حافظ ابنِ حجرؒ کے اس بیان سے استیعاب کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس میں تمام صحابہ کرامؓ کے حالات آ گئے ہیں' اور اس لیے اس کا نام استیعاب رکھا ہے بلکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام الاستیعاب اس لیے رکھا ہے کہ یہ متقدین کی کتابوں کے مباحث کو حاوی ہے۔

تلامذہ

حافظ ابنِ عبدابر کے جس طرح اساتذہ باکمال تھے اسی طرح آپ کے تلامذہ بھی باکمال ہوئے۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ کے ایک ممتاز شاگرد امام حافظ ابو عبداللہ حمیدی اندلسی (م ۴۸۸ھ) تھے۔ وہ ۴۲۰ھ میں اندلس میں پیدا ہوئے۔ امام حمیدی کی عدالت و ثقاہت' زہد و ورع' علم و فضل اور حفظ و ضبط کا اربابِ سِیَر نے اعتراف کیا ہے۔ کتاب الجمع بین الصحیحین اور تاریخ اندلس آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ امام ابوعلی حسین بن محمد بن احمد غسانی جیانی اندلسی (م ۴۹۸ھ) بھی آپ کے ممتاز شاگرد تھے۔ وہ ۴۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار اندلس کے ممتاز علمائے حدیث میں ہوتا ہے۔ آپ جملہ علومِ اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ عربی ادب' لغت' علم الانساب میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔

داعیانِ حق اور راہِ عزیمت

حافظ محمد ادریس

دعوتِ اسلامی کارِ انبیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انسان کے اندر ضمیر کی شمع روشن کی' قرآن مجید کے الفاظ میں یہ نفسِ لوّامہ ہے۔ یہ شمع بلاشبہ بڑی قیمتی اور مؤثر ہے مگر یہ بذاتِ خود کافی اور کامل نہیں ہے۔ ربِ کائنات نے اس شمع کے ساتھ ساتھ آفتابِ ہدایت بصورتِ وحی انسانوں کو عطا کر کے ضلالت کے اندھیروں کو مستقل طور پر دور کر دیا۔ انبیا نے اپنے فرائض بطریقِ احسن ادا کیے اور حق و باطل کو کھول کر بیان کر دیا۔ چونکہ انسان کو نفسِ لوّامہ کے ساتھ ساتھ نفسِ امّارہ کی آزمایش سے بھی دوچار کیا گیا ہے' اس لیے انسانوں کی قلیل تعداد ہی نے حق کا ساتھ دیا اور اکثریت نے روگردانی' بے اعتنائی' بغاوت اور عداوت کا راستہ اپنایا۔

سلسلۂ انبیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکا ہے۔ آپؐ کے بعد دعوتِ حق کا اہم فریضہ آپؐ کی امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ امت بحیثیتِ مجموعی عمومی طور پر اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں تساہل برت رہی ہے' بلکہ بعض اوقات اس کے ساتھ رویہ معاندانہ بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہر دور اور ہر ملک اور علاقے میں کچھ لوگ ہمیشہ ایسے موجود رہے ہیں جنھوں نے ناسامعد حالات میں یہ فریضہ سرانجام دیا۔

آئمہ اربعہ

تجدید و احیائے دین کی تحریکوں میں یوں تو بے شمار عظیم المرتبت شخصیتوں کے نام نظر آتے ہیں مگر آئمہ اربعہ کا خاص اور ممتاز مقام ہے۔ عموماً لوگ ان اماموں کو صرف فقہ کے بانی کی

حیثیت سے سمجھتے ہیں اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ فقہ کو مدون کرنے کے لیے ان کے کارنامے قیامت تک یادگار رہیں گے مگر وہ محض فقہی علما اور مفتی نہ تھے۔ بلکہ حقیقت میں اپنے دور کے استبداد اور شخصی حکومتوں کے مقابلے پر دعوتِ حق کے علمبردار تھے۔ دعوتِ حق کا کام مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اس کام کے نتیجے میں چاروں آئمہ ابتلا و امتحان سے گزرے۔ حضرت امام شافعیؒ نسبتاً براہِ راست تصادم سے محفوظ رہے۔ مگر دیگر تینوں آئمہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو تو حالات نے نظامِ حکومت کے ساتھ براہِ راست ٹکر لینے پر مجبور کردیا۔

حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے فقہی پیروکاروں کی تعداد امتِ مسلمہ کے درمیان سب سے زیادہ ہے۔ بے شمار لوگ ان سے قلبی لگاؤ اور گہری عقیدت رکھتے ہیں، مگر اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ حضرت امامؒ کا جنازہ جیل سے اٹھا تھا۔ ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ ان کے کچھ حالات درج کررہے ہیں۔

حضرت امامِ اعظمؒ کا اسمِ گرامی نعمان بن ثابت اور کنیت ابوحنیفہ ہے۔ آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ھ میں بحالتِ اسیری بغداد میں وفات پائی۔ آپ کوفے میں کپڑے کے سب سے بڑے اور کامیاب تاجر اور صنعت کار تھے۔ آپ نے زندگی کی تمام آسائشوں کو حق کی خاطر ترک کیا اور اپنے موقف پر ایسی استقامت دکھائی کہ مال و دولت کے ضیاع اور قید و بند کی صعوبتوں سے بھی ثابت قدمی میں لغزش نہ آئی۔

حضرت امامِ اعظمؒ کی علمی خدمات کا پوری دنیا میں شہرہ ہے مگر داعیِ حق کی حیثیت سے انھوں نے جو نقوشِ پا چھوڑے ہیں، حقیقت میں وہ روشنی کا مینار ہیں۔ مستبد حکمرانوں کے مقابلے پر امام ابوحنیفہؒ نے اپنے وقت کی اصلاحی تحریک کا ساتھ دیا۔ یوں تو محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کا ساتھ تو کئی لوگوں نے دیا مگر اس پر استقامت کا حق امامِ اعظمؒ ہی نے ادا کیا۔ ایک جانب ان کے سامنے قاضی کا منصب پیش کیا گیا جسے انھوں نے ٹھکرا دیا تو دوسری جانب زنداں کے دروازے کھول دیے گئے۔ امامِ اعظمؒ نے پسِ دیوارِ زنداں جانا پسند کیا مگر مداہنت برتنے سے صاف انکار کردیا۔

امام مالک بن انسؒ (۹۳ ھ تا ۱۷۹ھ) "امام دارالہجرت" کے عظیم لقب سے معروف ہیں۔

بنو عباس کے دور میں ان سے حکمرانوں نے اپنی مرضی کا فتویٰ لینا چاہا تو امام نے صاف انکار کردیا۔ اس کی پاداش میں انھیں ستر کوڑے بھی لگائے گئے اور گدھے پر سوار کرکے مدینے کی گلیوں میں گھمایا بھی گیا۔ آپ نے کوئی کمزوری دکھانے کی بجائے کھلم کھلا اپنے برحق موقف کا اعلان کیا اور مستبد حکمرانوں کے غلط افکار کا برملا ابطال بھی کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴ تا ۲۴۱ھ) بڑے عظیم المرتبت داعیِ حق تھے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے اٹھائے ہوئے فتنۂ خلقِ قرآن کے سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ سخت آزمائش سے دوچار ہوئے۔ معتصم کے دور میں ان پر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ متوکل کا دور آیا تو اس نے اشرفیوں کے توڑے بھیجے۔ امام نے طویل عرصے تک قید و بند اور کوڑے برداشت کیے مگر اشرفیوں کے توڑے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے کہا "متوکل کے توڑے معتصم کے کوڑوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔" امام نے نہ صرف یہ کہ وہ توڑے واپس بھیج دیے بلکہ حکومتِ وقت کی پیش کردہ تمام مراعات کو مسترد کردیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام احمد بن حنبلؒ کے امتحان کی خبر دی تھی اور ساتھ ہی یہ تاکید فرمائی تھی کہ وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ آنحضورؐ نے یہ بشارت بھی دی کہ اس ثابت قدمی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ قیامت تک ان کے نام کو بھی روشن رکھے گا اور ان کے علم کا نور بھی پھیلاتا رہے گا۔

دیگر آئمہ ہدایت

اس امت کے عظیم داعیانِ حق حضرت امام ابن تیمیہؒ، حضرت امام غزالیؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ وقت کی طاقتوں کو للکارتے رہے۔ ان کے دامِ تزویر میں آنے کی بجائے طوق و سلاسل کو منتخب کیا۔ ابتلا و آزمائش کی بھٹیاں انھیں جادۂ حق سے برگشتہ تو نہ کرسکیں، البتہ وہ ان سے کندن بن کر نکلے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اگرچہ سخت ابتلا اور زبردست تصادم کا دور تو نہ دیکھا مگر وہ بھی شاہی درباروں کی مراعات سے ہمیشہ دور رہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے عملی جہاد کا آغاز کرنے سے قبل اپنے آپ کو اور جملہ ساتھیوں کو جفاکشی کا عادی بنایا۔ زندگی کی سختیاں تربیتی نظام میں شامل کرکے آنے والے کٹھن مراحل کے لیے تمام وابستگانِ تحریک کو حق کے سپاہی بنا دیا۔ آسائش و

راحت ممنوع ہرگز نہیں' مگر جہاں آسائشیں راہِ جہاد کی رکاوٹیں بننے لگیں وہاں ان کا استعمال مناسب نہیں ہوتا۔ سید بادشاہ اور ان کا پورا قافلہ سلف صالحین کی زندہ مثال تھا۔ دنیا کو ان لوگوں نے آخرت کے بدلے میں فروخت کردیا تھا۔ وہ اپنے اس سودے پر راضی اور خوش تھے۔ ابھرتی ہوئی باطل قوتوں کے خلاف ان عظیم مجددین ملت نے ایک ایسے وقت میں جہاد کیا جب ہماری ملت بہ حیثیت مجموعی پوری دنیا میں ادبار و انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔ اس تحریک کے تمام وابستگان نے یادگار کارنامے سرانجام دیے۔ باطل سے مردانہ وار ٹکرائے اور کہیں مداہنت یا کمزوری نہیں دکھائی۔

علامہ اقبال دردِ دل رکھنے والے ایک عظیم شاعر اور مصلح تھے۔ انھیں مجدد کہنا تو مشکل ہے' مگر داعیانِ حق کے لیے جو بنیادی اوصاف ضروری ہیں' ان کی ترجمانی ان کے کلام میں نہایت موثر اور بلیغ انداز میں کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کا "شاہین" درحقیقت داعیِ حق ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ داعیِ حق کو اقبال کے شاہین کی زندہ مثال سمجھا ہے اور ہر داعیِ حق کے بارے میں یہی تصور قائم کیا ہے کہ وہ غیور و جسور' خوددار و خود بین' خدا خوف و خود آگاہ اور سیر چشم و درویش منش مخلوق ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبال کا شاہین ہے۔

ایمان اور آزمایش

داعیِ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزمایشوں کی کبھی تمنا نہ کرے۔ آزمایشوں سے حضور پاکؐ نے بھی پناہ مانگی تھی' ہر داعی کو بھی ان سے پناہ ہی مانگنی چاہیے۔ البتہ یہ چیز ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہنی ضروری ہے کہ دعوتِ حق اور آزمایش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات :

> ا ۔ ل ۔ م ۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمایش کرچکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔ (عنکبوت ۲۹ : ۱)

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' انھیں مردہ نہ کہو' ایسے لوگ تو

حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اور ہم ضروری تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمہاری آزمایش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے" انھیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔
(البقرہ ۲ : ۱۵۳ - ۱۵۷)

ہم ضرور تم لوگوں کو آزمایش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔ (محمد ۴۷ : ۳۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آزمایشوں کے مقابلے پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے صبر اور استقامت کی توفیق طلب کی اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ استقامت مومن کا بہت بڑا ہتھیار ہے، مگر اس کے حصول کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ استقامت کو متزلزل کرنے کے لیے داعیانِ حق کو ترغیب و ترہیب دونوں حربوں سے شکار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جس داعیِ حق کو اپنی خواہشات کی غلامی اور مرغوباتِ نفس سے نجات نہ مل سکے وہ کبھی استقامت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ شدائد اور مصائب کے مقابلہ پر جو داعی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے، بسا اوقات وہی داعی ترغیب و تحریص کے دام میں بآسانی گرفتار ہو جاتا ہے۔ داعیِ حق کو کسی چیز کا غلام اور عادی نہیں ہونا چاہیے۔ مبادا یہی چیز اور عادت اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔ بقول اقبال ؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

امام حسن البنا شہید کے بارے میں کافی عرصہ قبل میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ جب کبھی کسی کے ہاں جائیں تو چائے، کافی، مشروب جو کچھ بھی پیش کیا جائے اسے قبول کریں۔ مگر چائے اور کافی کو اپنی عادت نہ بنائیں۔ یہ عادت

غلامی کے مترادف ہوتی ہے اور کسی وقت بھی مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔

امام شہید کی یہ نصیحت میں نے پڑھی تو مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میں نے سوچا کہ چائے اور کافی کی عادت کون سا نشہ ہے مگر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرا خیال غلط تھا۔ میں نے بارہ سال کا عرصہ کینیا میں گزارا ہے۔ کینیا میں دنیا کی بہترین چائے اور کافی پیدا ہوتی ہے۔ چائے تو ہماری نسل سے پاکستان میں مروج ہو چکی تھی، مگر کافی کے باقاعدہ استعمال کا موقع کینیا میں میسر آیا۔ ہمارے دفتر میں چار بجے بعد دوپہر کافی پی جاتی تھی۔ مجھے کافی بہت اچھی لگی۔ سات آٹھ ماہ کافی پیتے گزر گئے تو ایک روز سفر کے دوران میں مجھے اچانک بے چینی اور بے کلی سی محسوس ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک طبیعت کیوں خراب ہو رہی ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد معاً" خیال آیا کہ کافی کا وقت ہو گیا ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں امام حسن البنا کی نصیحت تازہ ہو گئی اور اس کی حکمت کھل کر سامنے آگئی۔ اگلے روز معاونِ دفتر نے وقتِ مقررہ پر کافی کا کپ میری میز پر لا کر رکھا تو میں نے اس سے کہا کہ بھائی آج سے کافی بند۔ اس کے بعد آج تک کبھی کبھار کافی پی تو لیتا ہوں مگر اس کی مستقل عادت اور شوق ترک کر دیا ہے۔

معیارِ زندگی کا بت

نشہ حرام ہے اور شریعت نے اسے حرام قرار دینے میں بہت سی حکمتیں اور انسانی مصالح ملحوظ رکھے ہیں۔ انسان کو بنیادی ضروریات کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے مگر تعیشات سے پرہیز، عام انسانوں کے لیے مفید اور داعیانِ حق کے لیے ازحد ضروری ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے بارے میں فقروفاقہ سے زیادہ خوشحالی و فارغ البالی کو خوفناک قرار دیا ہے۔ جب انسان اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی فکر میں لگ جائے تو آہستہ آہستہ اس کے دل میں ہوس اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ آخر کار معیارِ زندگی کا بت دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس بت کی پرستش میں بظاہر بڑے بڑے موحدین مشغول نظر آتے ہیں اور بدقسمتی سے پوری زندگیاں اسی کی نذر کر دیتے ہیں۔

معیارِ زندگی کا یہ بت کتنا خطرناک ہے اس کے بارے میں الشیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود مرحوم نے نہایت مؤثر انداز میں وضاحت کی ہے۔ شیخ موصوف اخوان المسلمون کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ اخوان کی تحریک میں جدوجہد، ایثار اور قربانی میں گزارا۔ اخوان المسلمون کے متعلق لکھی جانے والی تمام کتابوں کے درمیان ان کی کتاب "الاخوان المسلمون"

نہایت معتبر اور مستند ہے جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ شیخ موصوف اخوان سے الگ ہو کر دین کی خدمت کرنے کے لیے جامعہ الازہر تشریف لے گئے۔ حکومت نے انھیں شیخ ازہر (وائس چانسلر) مقرر کر دیا۔

مصر میں یکے بعد دیگرے مستبد حکمران برسرِاقتدار آتے رہے۔ جامعہ الازہر ان حکمرانوں کی آلۂ کار بنی رہی۔ شیخ ازہر جو مصر ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے نزدیک اسلام کا علمبردار اور ترجمان سمجھا جاتا ہے، حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہوتا ہے۔

جامعہ الازہر کی تاریخ بہت طویل اور تابناک ہے۔ ماضی بعید میں بڑے جرات مند اور صاحبِ عزیمت علما نے جامعہ ازہر کی سربراہی کے فرائض سرانجام دیے۔ ان میں سے خاص طور پر شیخ عزالدین عبدالسلام کا اسمِ گرامی معروف ہے۔ وہ شاہانِ وقت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بادشاہ کبھی جامعہ میں آتا تو شیخ اس کے استقبال کے لیے دروازے پر انتظار کرنے کی بجائے اپنے کمرۂ تدریس میں دیوار سے ٹیک لگائے چٹائی پر پاؤں دراز کیے طلبہ کو پڑھانے میں مشغول رہتے۔ ان کا یہ قول بڑا مشہور ہے کہ "جو بادشاہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا وہ اس کے سامنے پاؤں پھیلا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سے کسی نے پوچھا کہ ازہر کے تابناک ماضی کی جھلک اس کے حال میں کیوں نظر نہیں آتی تو انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں اس کا جواب یوں دیا "شیخ عزالدین کچے کوٹھے میں رہتے تھے۔ گھر سے اپنے گدھے پر سوار ہو کر جامعہ میں تشریف لاتے تھے اور فارغ ہونے کے بعد اسی پر سوار ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔ ان سے کوئی کیا چھین سکتا تھا؟ اب صورتحال یہ ہے کہ شیخ ازہر کا مرتبہ مرکزی وزیر کے برابر ہے۔ مرسڈیز گاڑیاں، خدم و حشم، پرتعیش محلات اور بے پناہ مراعات اسے حاصل ہیں۔ یہ سب کچھ حکومت نے بلاوجہ نہیں دیا۔ یہ بلند معیارِ زندگی شیخِ ازہر کو مصلحت کیش اور بزدل بنا دیتا ہے۔" بقول حکیم الامت ؎

ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل
شاہیں گدائے دانۂ عصفور ہو گیا

اللہ تعالیٰ مرحوم شیخ ازہر کو جزائے خیر دے کہ وہ دوسروں کے لیے ایک اچھی اور مفید بات ارشاد فرما گئے ہیں۔

داعیانِ حق انسانوں کے درمیان رہتے اور انھی پر کام کرتے ہیں۔ حالات کے مدوجزر سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے اور دھوپ چھاؤں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اصحابِ اقتدار داعیانِ حق کو ہمیشہ بجا طور پر اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ حکمرانوں سے قرب دعوت پہنچانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے' مگر بسا اوقات اس کے نتیجے میں خود داعی غیر محسوس طور پر اپنے اوصاف کھونے لگتا ہے۔ عزیمت کی جگہ رخصت اور کشاکش کی بجائے مصالحت کا راستہ اقرب الی الصواب نظر آنے لگتا ہے۔ وقتی طور پر اچھے تعلقات کے نتیجے میں کچھ مفید اور اصلاحی کام بھی کروائے جاسکتے ہیں۔ مگر دعوتِ حق کی حقیقی منزل' مکمل اسلامی انقلاب تک پہنچنا بھرپور اور زور دار جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ داعیانِ حق جب مسلسل چھاؤں میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں تو پھر ان کے لیے دھوپ میں نکلنا ممکن نہیں رہتا۔ چھوٹے چھوٹے مفادات بڑے بڑے مقاصد پر غالب آجاتے ہیں اور داعی مسلسل بلندی سے پستی کی طرف لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اس سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ داعی صورتحال کا صحیح ادراک کرنے کی بجائے اپنے موقف اور روش کو درست ثابت کرنے کے لیے دلائل ڈھونڈنے لگتا ہے۔ نوبت یہاں تک آپہنچتی ہے کہ فریب خوردگی کے غبار میں جوہرِ قابل گم ہو جاتا ہے۔ شاعرِ مشرق کے الفاظ میں۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اسلامی تحریکیں: ماضی اور حال

معیشت و سیاست کے محاذ پر

خلیل احمد حامدی

سوڈان میں

افریقہ کا اسلامی گیٹ وے سوڈان ہے۔ سوڈان میں اسلام کا داخلہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے ہوا۔ اس طرزِ انقلاب کو مزید ترقی ہوئی اور سوڈان کی حدود عبور کرتے ہوئے مخلص مبلغین اور پاکیزہ کردار اولیا کے جلو میں اسلام کی شعاعیں اندرونِ افریقہ (چاڈ' نائیجر' نائیجریا' وسطی افریقہ) تک نور افگن ہو گئیں اور سیاہ فام دنیا جوق در جوق دامنِ اسلام سے وابستہ ہوتی گئی۔ نہ صرف وسطِ افریقہ' بلکہ مغربی افریقہ کے کناروں تک اسلام کا سیلِ رواں بہنے لگا۔ مہدی سوڈانی کی تحریک وہ آخری کوشش تھی جس نے سوڈان کے اسلامی تشخص کی حفاظت کی۔ اس کے بعد انگریزی استعمار آگیا جسے ۱۹۵۶ میں اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑا۔

خیال تھا کہ آزادی کے بعد سوڈان میں اسلامی نظام کا قیام عمل میں آئے گا' مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وہاں سیاسی اور عسکری حکومتیں یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آتی رہیں۔ سیاسی حکمرانوں میں اسماعیل ازہری اسلامی دستور کا وعدہ کرتے رہے' مگر عملدرآمد نہ کر سکے۔ عسکری حکمرانوں میں جعفر نمیری (۱۹۷۳ تا ۱۹۸۸) نے اشتراکیت کے بعد اسلام کی طرف رخ کیا' پھر خود ہی اس سے انحراف کر لیا۔ یوں سوڈان ' پاکستان کی طرح اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش کا میدان بنا رہا۔ جون ۱۹۸۹ میں جنرل عمر حسن بشیر کی قیادت میں سوڈان میں فوجی حکومت قائم ہو گئی۔ چونکہ جنوبی سوڈان میں جارج قرنق کی بغاوت کامیابی کو چھو رہی تھی' تمام عیسائی طاقتیں اس کی پشت پناہی کر رہی تھیں' سیاسی حکومت حالات پر قابو پانے سے عاجز آ رہی تھی' اور قریب تھا

کہ جنوبی سوڈان علیحدہ ہو جائے اور سوڈان کا عظیم ملک تاریخ کے بہت بڑے حادثے سے دو چار ہو جائے' چنانچہ جنرل عمر بشیر اور سوڈان کی اسلامی تحریک نے یکایک حالات کو ہاتھ میں لے لیا اور یوں سقوطِ جنوب کے حادثے سے سوڈان بچ گیا۔

جنرل عمر بشیر اور اس کے رفقا اور اسلامی تحریک کے مابین اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ سوڈان کو اقتصادی لحاظ سے خود کفیل' سیاسی لحاظ سے مکمل خود مختار اور مذہبی لحاظ سے اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ ان تینوں امور میں سوڈان کی موجودہ انقلابی حکومت نے ۴ سال کے عرصے میں حیرت انگیز کارکردگی دکھائی ہے۔ یہاں اس کارکردگی کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

اقتصادی لحاظ سے سوڈان اس حد تک خود کفیل ہو چکا ہے کہ اسے خوراک باہر سے درآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہی' حالانکہ سوڈان آزادی سے لے کر ۱۹۸۹ تک ۸۰ فیصد خوراک (گندم' گھی اور شکر) امریکہ سے لے کر کھاتا تھا۔ اس گداگری نے اس کی خودی پامال کر کے رکھ دی تھی۔ اب سوڈان کے پاس یہ تمام اشیا اس قدر وافر ہیں کہ وہ برآمد کر رہا ہے۔ لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ مشہور مثل ہے کہ جس کے اختیار میں اپنی روٹی نہیں ہے' اس کا فیصلہ بھی اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ روٹی میں خود انحصاری دوسروں کی درگاہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوڈان اب امریکہ یا کسی اور طاقت کا محتاج نہیں ہے' اور اپنی پالیسیوں میں خود مختار ہے۔ سوڈان کو مکمل اسلامی ریاست بنانے کے لیے بھی موجودہ حکومت ٹھوس اقدامات کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں وہ قانون کے استعمال سے زیادہ تربیتی وسائل سے کام لے رہی ہے۔ تعلیم' صحت' ابلاغِ عامہ اور قومی رہنمائی کے تمام ادارے منکرات کے استیصال اور معروفات کی ترویج میں لگے ہوئے ہیں۔ قوم کے اندر جہاد کی روح بیدار کی جا رہی ہے اور "پیپلز ڈیفنس" کے نام سے قوم کے تمام طبقوں کو عسکری' روحانی اور اخلاقی تربیت دی جا رہی ہے۔ اسلامی بنکوں کے ذریعے پسماندہ طبقوں کے لیے کاروبار کھول کر بے روزگاری کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ سوڈان کی زمین انتہائی زرخیز ہے' مگر صدیوں سے غیر آباد چلی آ رہی ہے۔ اسے ہنگامی اصولوں پر آباد کر کے بنجر سوڈان کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ تین کروڑ کی آبادی والے ۹ صوبوں کے ملک میں ۲۳ یونیورسٹیاں قائم کر دی گئی ہیں اور تعلیم کا جال بچھا دیا گیا ہے۔

دورِ حاضر میں سوڈان وہ خوش قسمت ملک ہے جس نے اسلامی نظام کے قیام میں دوسرے

مسلم ممالک سے سبقت حاصل کی ہے۔ مگر اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی۔ امریکہ سوڈان کے اسلامی رخ کو دیکھ کر آتشِ زیر پا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کے ذریعے (جن میں خلیجی ممالک سرِفہرست ہیں) اس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ وہ سوڈان کو باہر سے پڑول کا ایک قطرہ نہیں لینے دے رہا۔ چنانچہ وہ صرف ایران سے' اور وہ بھی نقد قیمت دے کر' تیل خرید کر گزارا کر رہا ہے۔ سوڈان کئی اشیا کو برآمد کرتا ہے' مثلاً گندم' چینی' مویشی اور جنگلی جانوروں سے حاصل ہونے والی چیزیں (سانپ کی کینچلی' تیر کی کھال' ہاتھی کے دانت وغیرہ)' مگر امریکہ نے ان اشیا کی برآمد پر ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ امریکہ سوڈان کو "دہشت گرد" قرار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ مگر سوڈان کی باضمیر اور جرات مند حکومت اور قوم امریکہ کے آگے ابھی تک سینہ سپر ہے۔ خدا خیر کرے۔

یمن میں

خلیجی ممالک میں یمن (شمالی حصہ اور جنوبی حصہ دونوں متحد ہو چکے ہیں) وہ واحد ملک ہے جہاں بادشاہی یا شیخی نظام نہیں ہے اور جہاں کسی درجہ میں انتخابی پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ تاریخ' مزاج اور زبان و نسل کے لحاظ سے شمالی یمن اور جنوبی یمن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ شمالی یمن مغربی استعمار کی دستبرد سے بچا رہا ہے۔ اس پر صدیوں تک ائمہ کی حکمرانی رہی ہے' جو مذہب کے لحاظ سے زیدی تھے۔ آخری امام' حمیدالدین اور اس کے بعد اس کا بیٹا امام بدر تھا' جس کا تختہ ۱۹۶۳ میں فوجی جرنیل سلال نے الٹ دیا تھا اور وہاں جمال عبدالناصر (مصر) کے تعاون سے اشتراکی آمریت قائم کر دی تھی' اور ملک کا اقتصادی اور اخلاقی لحاظ سے وہی حشر ہو گیا تھا جو اشتراکیت کے پنجۂ استبداد میں آنے والوں کا ہوا۔ اب بھی وہاں فوج کی بالواسطہ حکمرانی ہے اور اشتراکیت اور بعث پارٹی کے بچے کھچے عناصر آخری سانس لے رہے ہیں۔

جنوبی یمن پر انگریزی اقتدار ۱۹۶۳ تک رہا۔ انگریز حکمران کا ہیڈ آفس عدن میں تھا۔ اور جنوب میں ۹ شیخی ریاستیں تھیں' جن کے مقامی نواب انگریز کے ماتحت تھے۔ ان کو "ولایاتِ محروسہ" کہا جاتا تھا۔ آزادی کے وقت انگریز جنوبی یمن لیگ کو (جس میں اسلامی ذہن رکھنے والے عناصر بھی تھے) اقتدار سونپنے کے بجائے پیپلز لبریشن فرنٹ کو اپنا جانشین بنا گئے' جس پر بائیں بازو اور اشتراکی عناصر کا قبضہ تھا۔ پیپلز لبریشن فرنٹ نے "سابقہ" سوویت یونین کے ساتھ دوستی گانٹھ لی' اس کے سہارے حکمرانی کا تخت بچھا لیا' اور اسلام اور اسلامی اداروں کو ہر لحاظ سے تباہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ سوویت یونین کے سقوط اور کمیونزم کی پسپائی کے بعد ۱۹۹۱ میں

شمالی یمن اور جنوبی یمن دونوں متحد ہو چکے ہیں۔ اب یمن کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک حزبِ اشتراکی (جو جنوب کی نمائندگی کرتی ہے اور جسے پیپلز لبریشن فرنٹ ختم کر کے تشکیل دیا گیا ہے) اور دوسری نیشنل کانگریس جو شمال کی نمائندہ ہے۔ ان دو پارٹیوں کے مقابلے میں یمن کے اسلامی حلقوں نے مل کر اپنا اسلامی محاذ تشکیل دے لیا ہے جس کا نام "**التجمع الیمنی للاصلاح**" (یمن اصلاحی کنونشن) ہے۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۳ کے انتخابات میں متحدہ یمن کے اندر نیشنل اسمبلی کے انتخابات ہوئے ہیں۔ ان میں تینوں پارٹیوں نے حصہ لیا۔ "یمن اصلاحی کنونشن" نے اس انتخاب میں ۳۰۱ نشستوں میں سے ۶۸ نشستیں حاصل کیں، جبکہ سابق شمالی یمن کی حکمران پارٹی پیپلز کانگریس نے اوّل پوزیشن اور سابق جنوبی یمن کی حکمران پارٹی الحزب الاشتراکی نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ یمن اصلاحی کنونشن نے، جس کے صدر یمن کی نامور اور قابلِ احترام شخصیت عبداللہ الاحمر ہیں، پہلے تو اپوزیشن میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا، مگر صدر یمن علی صالح عبداللہ کی نیشنل کانگریس کے معتدل عناصر نے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ مخلوط حکومت میں شامل ہو جائے۔ اصلاحی کنونشن کی طرف سے یمن کے دستور میں اسلامی دفعات کے اضافے اور چند اور اصلاحی اقدامات کی شرائط پیش کی گئیں جنھیں نیشنل کانگریس نے سرانجام دینے کا وعدہ کر لیا اور اصلاحی کنونشن مخلوط حکومت میں شریک ہو گیا۔ اصلاحی کنونشن کے صدر عبداللہ الاحمر کو نیشنل اسمبلی کا سپیکر منتخب کر لیا گیا ہے، جنھیں دونوں سرکاری پارٹیوں کے سنجیدہ عناصر پسند کرتے ہیں۔ مزید برآں کنونشن (یا اسلامی محاذ) کو وزارتیں بھی دی گئی ہیں، ان میں وزارت تعلیم، وزارت صحت، وزارت تجارت و خوراک اور وزارت بلدیات شامل ہیں۔ ۱۷ اکتوبر کو جو صدارتی کونسل منتخب کی گئی اس کے دو رکن نیشنل کانگریس، دو رکن حزب اشتراکی اور ایک رکن اسلامی محاذ (اصلاحی کنونشن) کا لیا گیا ہے۔ اصلاحی کنونشن کی طرف سے یمن، بلکہ عالمِ اسلام، کی نامور شخصیت جناب عبدالمجید زندانی رکن نامزد کیے گئے ہیں۔ وہ اس کونسل میں رتبے کے لحاظ سے تیسری اہم شخصیت ہیں۔

بد قسمتی سے یمن کے صدر علی عبداللہ صالح اور سابق جنوبی یمن کے حکمران علی سالم البیض کے درمیان اختلافات نے سر اٹھا لیا ہے۔ یمن شدید خانہ جنگی کا شکار ہے۔ صنعا اور عدن تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ شمالی یمن ہر قیمت پر جنوبی یمن کو اپنے ساتھ رکھنا چاہ رہا ہے۔ جنوبی یمن کو یقین ہے کہ یہ اصرار اس کی تیل کی دولت پر قبضہ کے لیے ہے۔ اس اصرار نے فوج کشی اور گولہ باری کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دونوں فتح کے مژدے سنا رہے ہیں، لیکن کوئی بھی اتنا

طاقت ور نہیں کہ دوسرے کو زیر کرے۔

یمن کی اسلامی تحریک کے لیے مخلوط حکومت میں شمولیت پہلا تجربہ ہے۔ دونوں حلیف پارٹیاں فکر و نظر کے لحاظ سے اسلامی تحریک سے بڑا فاصلہ رکھتی ہیں' مگر جو امتیاز اسلامی تحریک کو حاصل ہے اس سے دونوں حلیف پارٹیاں خالی ہیں۔ جنوبی یمن کی حزبِ اشتراکی سقوطِ کمیونزم کے بعد ذہنی شکست سے دو چار ہے۔ سیاسی و اقتصادی لحاظ سے اس نے جنوب میں اپنے دورِ حکمرانی کے اندر کوئی قابلِ رشک اثرات نہیں چھوڑے۔ بلکہ عدن سے لے کر حضر موت تک تمام صوبے اقتصادی بدحالی' اخلاقی بے راہ روی اور مذہبی آزمایش سے دو چار ہوئے۔ نیز سقوطِ کمیونزم سے پہلے جنوبی یمن کے دو اشتراکی گروپوں کے درمیان ۴ ماہ تک شدید خانہ جنگی نے بھی جنوبی عوام کو اشتراکیت سے متنفر کر دیا اور ان کے اندر اسلامی اور عربی جذبات امڈ آئے۔ اسی دباؤ کے نتیجے میں جنوبی قیادت کو شمالی یمن کے ساتھ اتحاد کرنا پڑا۔ جہاں تک شمالی یمن کی نیشنل کانگریس کا تعلق ہے تو اسے بھان متی کا کنبہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس میں بعثی نظریات کے حامل افراد بھی موجود ہیں' شکست خوردہ عرب قوم پرست اور جمال عبدالناصر کے نام لیوا بھی۔ ابن الوقت قبائلی سردار بھی' اور کچھ نیک اور مخلص لوگ بھی اس کے دامن سے وابستہ ہیں جو یمن کو اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کے مقابلے میں اسلامی محاذ کے پاس تربیت یافتہ کارکنوں کی بہترین ٹیم موجود ہے' جو بے داغ ماضی' پاکیزہ کردار' ایمانی جرات اور ربانی حکمت و دانش سے بہرہ ور ہے۔ مگر کیا نیو ورلڈ آرڈر اسے برداشت کرے گا۔ اس کا جواب مستقبل قریب میں مل سکتا ہے۔ جو چیز بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی خواہ حکومت میں شامل رہے یا نہ رہے' وہ ملک کی ایک مضبوط طاقت ہے۔ اس میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے جو جوان جہاد کے دوران افغانستان کی وادیوں سے گزر چکے ہیں' وہ اس کی روحِ رواں ہیں۔ ان کے جذبۂ ایمانی کو کوئی طاقت پسپا نہیں کر سکتی۔

ملائشیا میں

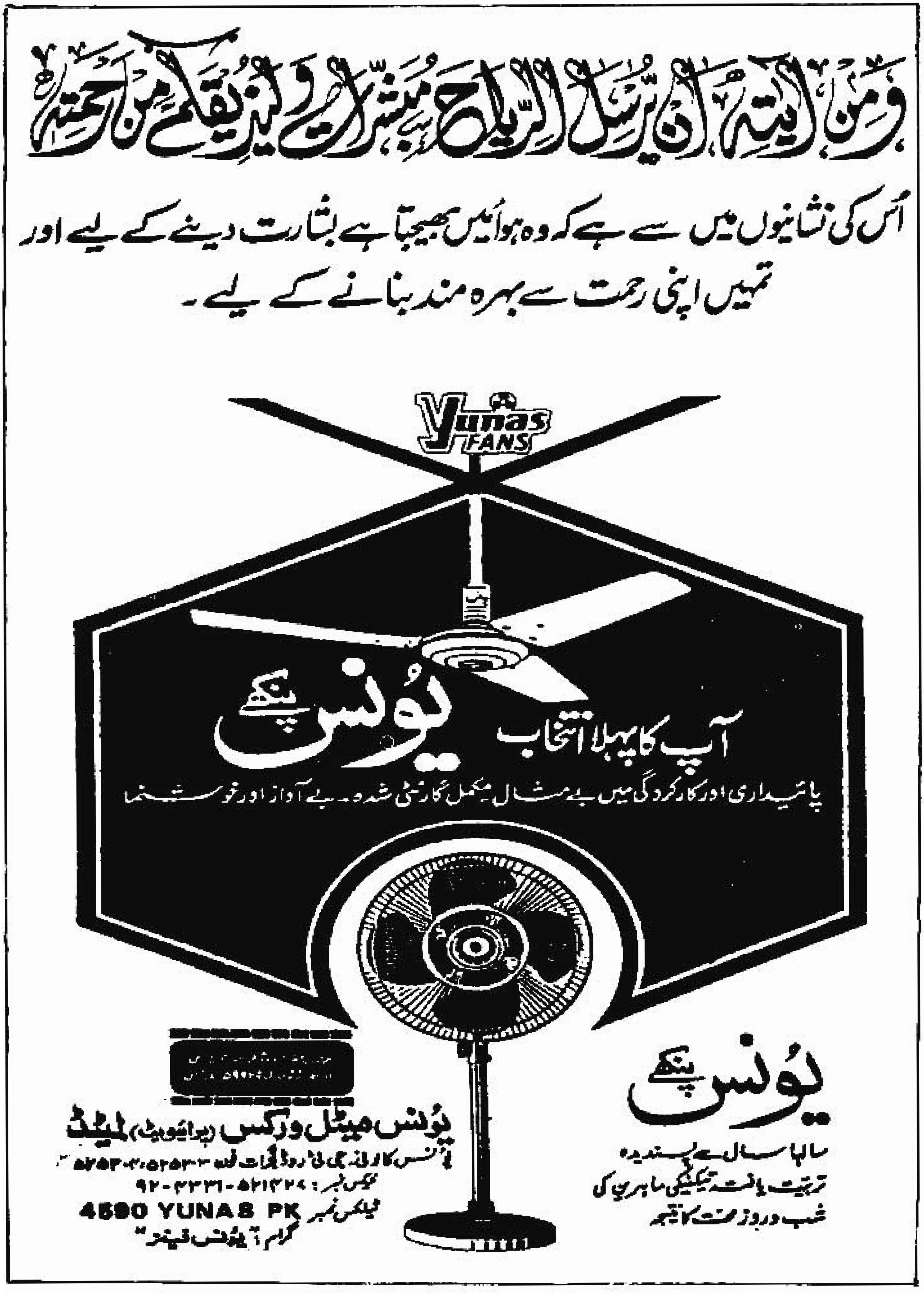
مشرقِ بعید میں دو بڑے مسلمان ممالک ہیں: انڈونیشیا اور ملائشیا۔ سیاسی لحاظ سے ملائشیا کسی حد تک جمہوریت اور بنیادی آزادیوں سے بہرہ مند ہے' جبکہ انڈونیشیا آزادی کے بعد مسلسل آمریت کے نرغے میں چلا آرہا ہے۔ پہلے سوکارنو (۱۹۴۵-۱۹۶۵) کی آمریت چھائی رہی اور پھر آج تک (۱۹۶۵-۱۹۹۳) سوہارتو کی آمریت چلی آ رہی ہے' جسے مقامی عیسائیوں اور لادینوں کی حمایت کے ساتھ مغرب کی پوری آشیر باد حاصل ہے۔ ملائشیا کے حالات شروع سے مختلف چلے

آرہے ہیں۔ یہ ملک انگریزی استعمار سے ۱۹۵۷ میں آزاد ہوا۔ اس وقت مجمع الجزائر ملایا کا صدر مقام سنگاپور تھا۔ ۱۹۶۳ میں ملایا کی ۱۱ ریاستوں نے سنگاپور کے ساتھ مل کر فیڈریشن آف ملائشیا کی تشکیل کی۔ ۱۹۶۵ میں دو مزید ریاستوں صباح اور سرواک نے اس فیڈریشن میں شرکت کا اعلان کیا۔ چینیوں کی اکثریت کے غلبہ کے اندیشہ نے بالاخر سنگاپور کو الگ کر دیا۔ جب کہ مذکورہ ۱۳ ریاستوں پر مشتمل ملائشیا وجود میں آگیا اور کوالالمپور اس کا دارالحکومت تجویز ہوا۔ ملائشیا کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے۔ اس میں ۵۸ فیصد ملائی مسلم' ۳۱ فیصد چینی' ۱۱ فیصد انڈین اور دیگر اقوام پائی جاتی ہیں۔

یہاں دو بڑی اسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ ایک ملائشین ینگ مسلم آرگنائزیشن جسے اے بیم کہتے ہیں۔ یہ ان نوجوانوں نے تشکیل دی ہے جو یورپ اور امریکہ میں پڑھتے رہے ہیں اور وہاں اسلامی تحریکوں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ یہ لوگ مولانا مودودیؒ اور امام حسن البناؒ کی دعوت و تحریک سے متاثر ہیں۔ ان کی موجودہ پالیسی ڈاکٹر محاضر کی حکومت سے تعاون پر مبنی ہے۔ چنانچہ اے بیم کے سابق سربراہ انور ابراہیم محاضر حکومت میں ۸ سال سے وزیر چلے آرہے ہیں۔ آج کل وزارتِ خزانہ ان کے پاس ہے۔ انھوں نے مزید ترقی یہ کی ہے کہ گورنمنٹ پارٹی U M N O (یونائیٹڈ ملائشین نیشنل آرگنائزیشن) کے حالیہ پارٹی الیکشن (نومبر ۱۹۹۳) میں وہ ڈپٹی چیئرمین منتخب ہو گئے ہیں۔ چیئرمین خود وزیر اعظم ہوتا ہے۔ گویا وہ مستقبل کے وزیر اعظم کہے جا سکتے ہیں۔ دوسری اسلامی تحریک اسلامک پارٹی ہے جس کا مخفف "پاس" ہے۔ اس کا قیام 1951 میں عمل میں آیا تھا۔ پہلے تو یہ ایک محض مسلم تنظیم کی حیثیت سے ابھری تھی جیسی پاکستان میں مسلم لیگ' لیکن ۱۰ سال سے اس پر تحریکِ اسلامی سے وابستہ لوگوں کا غلبہ ہے۔ اور اب اس کا دعوتی و تربیتی نظام اور پوری فکر اسلامی تحریک کے رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ اس کے سربراہ استاذ فاضل نور ہیں۔ اس نے ملائشیا کو صحیح معنوں میں "اسلامی ریاست" میں تبدیل کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ دنیا کی دوسری اسلامی تحریکوں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات قائم ہیں۔ ۱۹۸۹ کے انتخابات میں "پاس" کو ریاست کلنتان میں مقامی انتخابات میں اکثریت حاصل ہوئی ہے اور اس نے وہاں اپنی حکومت تشکیل دی' جس کے سربراہ (منتری بیسار) ایک وسیع النظر عالمِ دین' نک عبدالعزیز ہیں۔ مرکز میں "امنو" کی حکومت سیکولرزم کی علمبردار ہے جبکہ "پاس" اسلامی نظام کی داعی ہے اور کلنتان میں اس نے اپنے اختیارات کی حد تک اسلامی نظام کا نفاذ شروع کر رکھا ہے۔ اس نے کلنتان میں شراب' جوئے اور قحبہ گری پر پابندی عائد کر دی ہے' ملازمین کی تنخواہوں میں

معقول اضافہ کر دیا ہے' جدید تعلیم اور دینی تعلیم کو یکجا کر دیا ہے۔ ریاستی زمین جو عرصے سے غیر آباد پڑی تھی غریب کاشتکاروں میں تقسیم کر دی ہے۔ بے روزگاری کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا جامع اور مربوط نظام جاری کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر اسلامی اصلاحات کے لیے تیار کیا جا سکے۔ "تقویٰ بستی" کے نام سے دیہی علاقوں میں صاف ستھرے گاؤں قائم کیے جا رہے ہیں۔ ریاستی سرمائے کو سودی بنکوں سے نکال کر غیر سودی بنکوں میں رکھ دیا گیا ہے۔ "اسلامی رہن" سسٹم جاری کر کے کم آمدنی والے لوگوں کو قرضِ حسنہ دیا جا رہا ہے۔ اس سسٹم کے تحت لوگوں سے کچھ چیزیں رہن رکھ لی جاتی ہیں اور قرض دے دیا جاتا ہے اور جب وہ قرض واپس کرتے ہیں تو ان کی اشیا ان کو واپس دے دی جاتی ہیں۔ ریاست کا وزیر اعلیٰ اپنی سابقہ کٹیا میں رہتا ہے۔ اس نے اپنے لیے نہ کوئی گارڈ لی ہے اور نہ کوئی گھریلو خادم۔ اس کی سادگی نے عوام کو انگشت بدنداں کر رکھا ہے۔ ریاست کلنتان کی یہ اصلاحات پڑوسی ریاستوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مرکزی حکومت کی طرف سے ریاست کی اسلامی حکومت کو کوئی تعاون نہیں مل رہا ہے۔

(جاری ہے)


وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ
اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور
تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔
Yunas FANS
آپ کا پہلا انتخاب یونس پنکھے
پائیداری اور کارکردگی میں بے مثال۔ مکمل گارنٹی شدہ۔ بے آواز اور خوشنما
یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
یونس کارنر جی ٹی روڈ گجرات فون
فیکس نمبر: ۹۲-۴۳۳۱-۵۲۱۳۲۶
ٹیلکس نمبر 4590 YUNAS PK
گرام: "یونس فینز"
یونس پنکھے
سالہا سال سے پسندیدہ
تربیت یافتہ تیکنیکی ماہرین کی
شب و روز محنت کا نتیجہ

مصری طالبات کا ایک مطالعہ
احیائے اسلام کے اثرات

مسلم سجاد

ساری دنیا میں احیائے اسلام کی جو لہر اٹھ کھڑی ہوئی ہے' اس کا ایک بڑا اور بہت اہم مرکز مصر ہے' جہاں اخوان المسلمون کی عظیم الشان اور قدیم تحریک اس مقصد کے لیے ۱۹۲۸ سے سرگرمِ عمل ہے' اور الجماعۃ الاسلامیہ جیسی تنظیم بھی وجود میں آ چکی ہے۔ تحریکِ اسلامی نے جو گہرے اثرات مصری خواتین اور طالبات پر ڈالے ہیں وہ اپنوں اور غیروں سب کے لیے باعثِ حیرت ہیں۔ اس لیے کہ مصر نپولین کے ذریعہ سب سے پہلے مغربی تہذیب کی یلغار کا شکار ہوا' اور وہاں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سب سے بڑھ کر مغرب زدگی کا شکار بنیں' یہاں تک کہ نہ صرف انھوں نے حجاب کو خیرباد کہا' بلکہ اسکرٹ کا نیم عریاں لباس بھی اختیار کر لیا۔ اب اسلامی تحریک نے تعلیم یافتہ خواتین میں مغرب زدگی کی اس رَو کا رخ پلٹا دیا ہے' اور یہ اہلِ مغرب کے لیے ایک سخت "تشویشناک" امر ہے۔

عرصہ سے مغرب کی علمی سرگرمیوں کا ایک دائرہ یہ بھی ہے کہ وہ عالمِ اسلام کے موجودہ حالات کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جامعات اور تحقیقی ادارے تحقیق کاروں کو متعین موضوعات کے حوالے سے مسلم ممالک بھیجتے ہیں' تاکہ وہ یہاں کے رجحانات کے بارہ میں براہِ راست تحقیق و مشاہدہ کی بنیاد پر معلومات فراہم کریں' جن کی روشنی میں مغرب اپنی پالیسی بنا سکے۔

اس کے بالمقابل اگر ہم مسلم ممالک کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو یہ انتہائی افسوسناک صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ مغرب تو کجا' اپنے دوسرے برادر اسلامی ممالک کے بارہ میں بھی براہِ راست جاننے کی کوئی کوشش نہیں۔ ہمارے وہ صحافتی ادارے' جو اپنی ایمپائر بنا چکے ہیں' یہ

تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اہم مسلم ممالک کے دارالخلافوں میں اپنے نمائندے متعین کریں تاکہ وہاں کے صحیح حالات سے ان کے ملک کے مسلمان آگاہ ہوں۔ جو خبریں' تبصرے اور جائزے مغربی اخبارات شائع کرتے ہیں' ہمارے اخبارات انھی کو شائع کر دینا بہت بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پڑھنے والے دنیا کو ویسا ہی دیکھتے ہیں جیسا مغرب دکھانا چاہتا ہے۔

اس کا تو بھلا کیا سوال ہے کہ ہمارے تحقیقی ادارے اور جامعات تحقیقی منصوبے ہاتھ میں لیں' مطالعاتی دوروں کا انتظام کریں' پی ایچ ڈی کے لیے ایسے موضوعات دیے جائیں اور ان کے ساتھ اتنا مالی عطیہ بھی ہو کہ تحقیق کار متعلقہ ممالک میں قیام کرے اور معلومات حاصل کرے۔

مصر میں احیائے اسلام کی لہر کے بارہ میں کافی عرصہ سے ہمارے اخبارات میں مختلف خبریں شائع تو ہو رہی ہیں' مگر وہ نہ صرف نہایت سرسری اور سطحی معلومات ہوتی ہیں' بلکہ بیشتر مغرب کی فراہم کردہ' اور انھی کے نقطۂ نظر کی عکاس ہوتی ہیں۔ ہماری کسی جامعہ یا تحقیقی ادارے کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہاں کے حالات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ خود ہمارا کوئی سکالر جاکر صورتِ حال کا مشاہدہ کرے اور ہمیں آگاہ کرے۔

حال ہی میں امریکہ کے ایک وقیع علمی رسالہ "دی مسلم ورلڈ" میں قاہرہ کی طالبات کے ایک مطالعہ کے حوالے سے وہاں احیائے اسلام کی علم بردار طالبات کے بارہ میں اعداد و شمار پر مبنی ایک مضمون "Young women members of the Islamic Revival Movement in Egypt" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مغرب کے مقاصد کے لیے سہی' مغرب کی عینک ہی سے سہی' لیکن ان کا یہ معلوماتی مطالعہ اس قابل ہے کہ ہم اس سے واقف ہوں اور یہ جانیں کہ مغرب ہمارے بارہ میں کس طرح سوچ رہا ہے۔

بنیادی طور پر یہ مطالعہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ملازمت اور شادی کے حوالہ سے خواتین کے تعلیم جاری رکھنے یا ختم کرنے کے بارہ میں رویے اور ان کی وجوہات معلوم کی جائیں' اور اس کا تعلق' بقول حسنی مبارک' مصر کے "ام المسائل" یعنی اضافۂ آبادی سے معلوم کیا جائے۔ لیکن کیونکہ جن طالبات کو تحقیق کے لیے منتخب کیا گیا' ان کا ایک حصہ اسلام پسند طالبات پر مشتمل تھا' اس لیے انھی حاصل کردہ معلومات سے تحقیق کاروں نے طالبات پر احیائے اسلام کے اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے' اور الجماعۃ الاسلامیہ کی ارکان کے ملازمت' شادی' اولاد جیسے معاملات کے بارہ میں رویوں کا غیرارکان عام طالبات کے رویوں سے تقابل بھی کیا ہے۔

اس مطالعہ کے لیے قاہرہ کے پبلک اسکولوں کی ۸۰۰ طالبات سے' جو پرائمری' وسطانی اور ثانوی جماعتوں کی سینئر کلاسوں میں تھیں' اور جن کی اوسط عمریں علی الترتیب ۱۲' ۱۵ اور ۱۸ سال تھیں' ۳ سال کی مدت میں ۷ مرتبہ انٹرویو لیے گئے۔ پہلا انٹرویو ۱۹۸۰ کے شروع میں اور آخری ۱۹۸۳ کے آخر میں لیا گیا۔ اس طرح اسی مطالعہ سے ۱۰ سال قبل کی تصویر سامنے آتی ہے۔ گزشتہ دس سال میں اسلام کا پیغام زیادہ وسعت و قوت اختیار کر چکا ہے۔ ۱۹۸۷ کے پارلیمانی انتخابات میں اخوان المسلمون اور سوشلسٹ لیبر پارٹی کے اتحاد کو ۲۱ فی صد ووٹ حاصل ہوئے ہیں۔ معاشرتی اور سیاسی طور پر احیائے اسلام کے اثرات اتنے نمایاں ہیں کہ سارے مغرب میں پریشانی ہے۔

انٹرویوز کے دوران ۸۰۰ کے سیمپل میں الجماعۃ الاسلامیہ کی ۳۷ ارکان کی موجودگی کا پتا چلا' یعنی کُل کا تقریباً ۵ فی صد۔ ہر لحاظ سے یہ ایک بڑی تعداد ہے۔

ارکان اور عام طالبات کا تقابل

ملازمت: گھر سے باہر کام' یعنی ملازمت کے بارہ میں' عام طالبات میں ۵۷ فی صد یہ تصور رکھتی ہیں کہ گھر سے باہر ملازمت سے عورت کو مرد کے مساوی درجہ حاصل ہوتا ہے' جب کہ ارکان میں صرف ۳۰ فی صد اس تصور کی حامی ہیں۔ ۲۷ فی صد ارکان ہر طرح کے حالات میں گھر سے باہر ملازمت کی بالکل مخالف ہیں' جب کہ عام طالبات میں یہ تعداد صرف ۱۰ فی صد ہے۔ جہاں تک شادی شدہ عورتوں کی ملازمت کا تعلق ہے' ۶۵ فی صد ارکان اس کی مخالف ہیں' جب کہ عام طالبات میں یہ تعداد ۳۶ فی صد ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد' ۵۷ فی صد ارکان کی رائے میں عورتوں کو ملازمت چھوڑ کر گھر میں رہنا چاہیے' اور ۳۸ فی صد کی رائے میں بغیر تنخواہ کی طویل رخصت لے لینا چاہیے۔ یعنی صرف ۵ فی صد کام جاری رکھنے کی حامی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عام طالبات میں بھی صرف ۱۱ فی صد ہی کام جاری رکھنے کی حامی ہیں۔ ۴۴ فی صد ارکان کی نظر میں عورتوں کے لیے سب سے مناسب پیشہ تدریس ہے' جب کہ ۲۲ فی صد سمجھتی ہیں کہ ہر ملازمت عورتوں کے لیے غیر موزوں ہے۔

ملازمت کے دوران مردوں سے رابطے کے بارہ میں ۳۵ فی صد نے مکمل مخالفت کی اور ۵۳ فی صد نے مناسب حدود کے اندر قبول کرنے کی رائے دی۔

اولاد: اس سوال کے جواب میں کہ شادی کے فوراً بعد بچے ہوں یا اسے ملتوی کیا جائے' ارکان میں ۶۲ فی صد نے ملتوی کرنے کے خلاف رائے دی' جب کہ عام طالبات میں سے ۵۸ فی

صد' بچے ملتوی کرنے کے حق میں تھیں۔

ان اعداد و شمار پر رائے دیتے ہوئے تحقیق کاروں نے اپنے مقصدِ تحقیق کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ یہ اراکین احیائے اسلام کے اثرات کی وجہ سے' ملازمت کی مخالف ہیں اور شادی کے فوراً بعد بچوں کے حق میں ہیں۔ اگر یہ اثرات نہ ہوتے تو یہ طالبات تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کرتیں' اور ان کے ملازمت کرنے سے بچوں کی شرح پیدائش میں کمی ہوتی۔ اس طرح احیائے اسلام کے اثرات خاندانی منصوبہ بندی کی سرکاری مہم کے خلاف پڑتے ہیں۔

تحقیق کاروں نے الجماعۃ الاسلامیہ کی ان اراکین کے بارہ میں کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں' جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

الجماعۃ الاسلامیہ کا رکن بننے کے لیے کسی رسمی کارروائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اسلام پر ایک طریقۂ زندگی کی حیثیت سے اپنے ایمان کے اظہار کے لیے شامل ہوتی ہیں۔ تحقیق کاروں کی رائے میں' عموماً اس کا ایک بڑا محرک مصری معاشرہ میں مغرب کے تہذیبی اثرات کی مخالفت ہے۔ وہ الجماعۃ الاسلامیہ کی ایک نوجوان خاتون کا یہ بیان پیش کرتے ہیں :

> کبھی ہم یہ سمجھتے تھے کہ ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی کے لیے مغربی معاشرہ میں سب کچھ ہے۔ اگر ہم مغرب کے پیچھے چلے تو ہم ترقی کریں گے۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ یہ درست نہیں ہے۔ مغربی معاشرے بیمار معاشرے ہیں۔ ان کی مادی خوشحالی بھی توڑپھوڑ کا شکار ہے۔ امریکہ میں جرائم اور فحاشی کا دور دورہ ہے۔ روس کا حال بدتر ہے۔ کون ایسا بننا چاہے گا؟ ہمیں خدا کی طرف آنا چاہیے۔

ان اراکین کے لباس کے بارہ میں بھی تحقیق کاروں نے خاص طور پر لکھا ہے۔ لباس سے ان کے تحریک سے تعلق کے درجہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مختلف اسٹائل سے رکنیت کے تین درجے واضح ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلہ کے لیے خصوصی طور پر بنے ہوئے لباس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب طالبات الجماعۃ الاسلامیہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں' اور فیصلہ ۱۲ سال کی عمر میں بھی کیا جا سکتا ہے' تو وہ پینٹ سوٹ یا لمبی اسکرٹ کے ساتھ طویل آستینوں کا بلاؤز پہنتی ہیں' اور سر پر سکارف باندھ لیتی ہیں۔

دوسرے درجے میں مکمل پردہ دار لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ سر پر عام اسکارف کے بجائے الخمر اوڑھا جاتا ہے' جو سر کو اور پشت پر بالوں کو بھی ڈھک لیتا ہے۔ سامنے سے یہ ٹھوڑی کے نیچے سے گزرتا ہے' لیکن چہرہ کھلا ہوتا ہے۔ یہ کیتھولک نن کے سر کے لباس کے مشابہ

ہے۔ جسم پر الجلباب ہوتا ہے' جو لمبی آستینوں والا ڈھیلا ڈھالا لباس ہے۔

تیسرے مرحلے میں نقاب ڈالی جاتی ہے۔ یہ ایک مستطیل کپڑا ہے' جو سر کے پیچھے باندھا جاتا ہے اور سامنے سے یہ آنکھوں کے نیچے چہرہ کو چھپاتا ہے۔ عام طور پر آنکھوں پر چشمہ لگایا جاتا ہے۔ نقاب کو اکثر الاسٹک سے باندھا جاتا ہے تاکہ جب خاتون دوسری خواتین کے ساتھ یا گھر میں ہو تو نقاب کو اتارا جا سکے۔

پہلے دو مرحلوں کی خواتین کو محجبات اور تیسرے مرحلے کی خواتین کو منتقبات کہا جاتا ہے۔

تحقیق کار کہتے ہیں کہ اسلامی لباس شرم و حیا کے علاوہ بھی بہت کچھ دیتا ہے۔ یہ پردہ کرنے والوں کے درمیان معاشی تفاوت پر بھی پردہ ڈال دیتا ہے اور سب کو ظاہرا ایک جیسا بنا دیتا ہے۔

ہمارے سیمپل کی طالبات ۳ سال سے اسلامی لباس پہن رہی تھیں۔ اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی لباس پہن کر آپ کیسا محسوس کرتی ہیں' ۲۸ فی صد نے اطمینانِ قلب اور ۴۱ فی صد نے خدا سے قربت کی کیفیت کا اظہار کیا۔

صرف ۱۳ فی صد نے ہچکچاہٹ کی کیفیت بیان کی۔

۴۱ فی صد طالبات نے کہا کہ انھوں نے اپنی ایک نہ ایک سہیلی کو تحریک میں شامل ہونے اور اسلامی لباس پہننے پر آمادہ کیا۔

۷۹ فی صد طالبات سمجھتی ہیں کہ تحریک میں شمولیت نے ان کی زندگیوں کو تبدیل کر دیا ہے۔

۹۱ فی صد نے کہا کہ ان کی نسبت جس سے طے ہو اسے مذہبی ہونا چاہیے۔ اگر ان کے منگیتروں نے چاہا کہ وہ اسلامی لباس ترک کر دیں تو ان کا رویہ کیا ہو گا؟ صرف ۳ فی صد نے کہا کہ وہ مان لیں گی۔ سیمپل کی ۵۸ فی صد طالبات نے کہا کہ اگر تحریک اور منگیتر کے درمیان انتخاب کرنا پڑا تو وہ منگیتر کو چھوڑ دیں گی۔ اس سے ان کے اپنے مقصد سے تعلق کی گہری مضبوطی کا اظہار ہوتا ہے' اس لیے کہ مصر میں عورت کے لیے شادی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

سب سے دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ تحریک کی یہ ارکان طالبات عام طالبات کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ ہیں' اعلیٰ تعلیمی معیار کی حامل ہیں' اور زیادہ تعلیم یافتہ گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ۳۰ فی صد کے باپ' اور ۱۴ فی صد کی مائیں یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں' جب کہ عام طالبات میں یہ تناسب ۱۸ اور ۴ فی صد ہے۔ سماجی اور معاشی حیثیت سے بھی یہ آگے ہیں۔ ارکان کی ۸۶ فی صد تعداد متوسط اور اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے' جب کہ عام طالبات میں یہ تعداد ۷۰ فی صد

ہے۔ اس طرح مغرب کے اس نظریہ کا پول بھی کھل جاتا ہے کہ احساسِ محرومی' معاشی پس ماندگی اور مستقبل سے مایوسی جیسے عوامل کے بل پر اسلامی تحریکیں قوت پکڑ رہی ہیں۔

اختتام پر' تبصرہ کرتے ہوئے تحقیق کاروں نے لکھا ہے کہ یہ نوجوان لڑکیاں اسلام کے روایتی طریقوں پر اپنے یقین کا اظہار کر رہی ہیں اور مصر کے بیشتر معاشرہ میں کئی عشروں سے جو طریقِ زندگی رائج ہے' یہ اس کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ اگر نوجوانوں کا یہ نمونہ کل کی تحریک کا نمائندہ ہے' تو مصری معاشرہ کے مستقبل کے لیے اس کے مضمرات بڑے "خطرناک" ہیں۔

ایک مسلم معاشرہ کے اسلامی رجحانات کے بارہ میں یہ مغربی مطالعہ' معلومات اور دلچسپی کے علاوہ اس لیے بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ مسلم معاشروں کا مطالعہ مسلم نقطۂ نگاہ سے کیے جانے کی ضرورت کا احساس بیدار ہو۔

رسائل و مسائل

نمازِ جنازہ مسجد کے اندر یا باہر

بعض مساجد میں نمازِ جنازہ کھلی جگہ پر پڑھی جاتی ہے اور بعض میں صرف جنازہ باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ صحیح صورت کیا ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول کے طور پر نمازِ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی ہے۔ مسجدِ نبویؐ سے باہر جنازگاہ تھی جس کو مصلی الجنائز کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے مسجدِ نبویؐ کے ایک دروازے کا نام باب الجنائز ہے۔ البتہ عذر کی بنا پر آپؐ نے کبھی مسجدِ نبویؐ میں بھی نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔

فقہا حنابلہ اور شوافع کے نزدیک مسجد میں بلا کراہت نمازِ جنازہ جائز ہے۔ المجموع شرح المہذب میں ہے "الصلوۃ علی المیت فی المسجد صحیحۃ جائزۃ لا کراھۃ فیھا"۔

علامہ ابنِ قیم حنبلی لکھتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد میں جنازہ پڑھنے کا معمول نہ تھا۔ آپؐ مسجد سے باہر نمازِ جنازہ پڑھتے تھے الّا یہ کہ کوئی عذر ہوتا۔ کبھی آپ نے مسجد میں بھی نمازِ جنازہ پڑھی ہے جیسا کہ ابنِ بیضاء کی نمازِ جنازہ۔

صورتیں دونوں جائز ہیں، البتہ افضل مسجد سے باہر نمازِ جنازہ پڑھنا ہے۔ (بحوالہ فقہ السنہ، ج اوّل، ص ۵۳۳)

فقہا احناف اور مالکیہ کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔ فقہا احناف کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے کہ بلا عذر آپؐ نے مسجدِ نبویؐ میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔ حتیٰ کہ نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی باہر جنازہ گاہ میں نکل کر پڑھائی۔ اس کے علاوہ قولی احادیث بھی ہیں۔ جن میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے والوں کے اجر کی نفی کی گئی ہے۔ شوافع اور حنابلہ کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ بیضاء کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی تھی۔ دلائل کے لحاظ سے راجح بات وہی ہے جسے احناف اور مالکیہ نے اختیار کیا ہے کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کا معمول ہے اور ایک دو جنازے اگر کسی عذر سے مسجد کے اندر پڑھے ہیں تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بلا عذر بھی بلا کراہت ایسا کرنا جائز ہے۔

فقہا احناف کا مسلک

فقہا احناف کے نزدیک سب سے اولیٰ صورت تو یہ ہے کہ میت بھی مسجد سے باہر ہو اور نمازی بھی مسجد کے باہر کھڑے ہوں۔ درِمختار اور ردالمختار میں ہے "**والمختار الكراهته مطلقا**" اس کے مطابق میت اور نمازی دونوں کو مسجد کے باہر ہونا چاہیے۔ اور یہ صورت بھی جائز ہے (دوسرے درجہ میں) کہ میت تو مسجد سے باہر ہو اور نمازی مسجد میں کھڑے ہوں۔ المبسوط سرخسی میں ہے "**عندنا اذا كانت الجنازة خارج المسجد لم يكره ان يصلى الناس عليها فى المسجد**(ج دوم' ص ۶۸)۔

عام معمول تو یہی ہونا چاہیے کہ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی جائے اور میت بھی باہر ہو' لیکن حرج اور ہجوم کی وجہ سے کبھی اس طرح کرنا پڑ جائے کہ میت مسجد سے باہر رکھ دی جائے اور نمازی مسجد میں کھڑے ہوں تو اس عذر کی وجہ سے ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ جمعہ کے روز چونکہ بھیڑ ہوتی ہے' اس لیے دفعِ حرج کی خاطر میت کو مسجد سے باہر رکھ کر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

میت کے حق میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی نمازِ جنازہ مسجد کے اندر ہوئی ہے یا باہر۔ فرق جو بھی پڑتا ہے وہ نماز کے لحاظ سے ہے کہ ان کے ثواب میں کمی بیشی ہوتی ہے کہ نہیں۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا اور مالکیہ اور احناف کے نزدیک مسجد کے اندر ثواب میں کمی ہوتی ہے' اور مسجد کے باہر پورا ثواب ملتا ہے۔ لیکن اس فرق کے باوجود جنازہ تو ہو جاتا ہے۔ اس واسطے کسی کے نزدیک بھی اس جنازے کا اعادہ نہیں ہے جو مسجد میں پڑھا گیا ہو۔

(عبد المالک)

کتاب نما

سرمایہ حیات : از پروفیسر اسرار احمد سہاوری۔ ناشر: فروغ ادب اکادمی' ۱۰۸ بی' سیٹلائٹ ٹاؤن' گوجرانوالہ۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

عجیب بات ہے' جتنی زیادہ یگانگت جدھر ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ کوتاہی واقع ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب تو میرے اپنے ہیں' اور میرے بالکل پاس ہیں۔ پھر کمال یہ کہ نہ وہ اصرار کرتے ہیں' نہ وہ گلہ شکوہ سے کام لیتے ہیں' بلکہ کسی نہ کسی جانب سے ان کی محبت متبسم ہو کر نمودار ہوتی ہے۔ لہذا ساری کوتاہیوں کے باوجود دل خوش ہو جاتا ہے۔ مگر میں اپنی کوتاہی کا بصد شرمساری اظہار کرتا ہوں' کیونکہ ایک قیمتی بلکہ نایاب محب کے دل میں ذرا بھی چبھن رہے تو میرے سینے میں سانپ لوٹتے رہیں گے۔

ابتدا میں تو ہلکا سا اپنا تعارف ہے۔ مہاجرت' سنٹرل ایکسائز انسپکٹری' حافظ آباد میں رہائش' پھر جماعتی دباؤ کے تحت نوکری چھوڑ کر شرکت انتخابات' ناکامی پھر دوکانداری' پھر ناکامی' پھر "زیکاری دور" (یعنی پیغمبروں کا سا زمانہ)' پھر مجلس زبان دفتری کے تحت قانونی اصطلاحات کے ترجمے کا مشغلہ' پھر مزید تعلیم (ڈبل ایم - اے)' پھر اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں لکچرر شپ اور پھر---! سرمایہ حیات ہی کے تحت ذہنی' فنی اور خدمتی رجحانات کے ذکر میں شخصیت اسرار کی جھلکیاں۔ زندگی کے تین واقعات بڑے اہم ہیں۔ پھر سوانح کے عنوان سے سیاسی (تحریک اسلامی) کی حکایت کا آغاز سی آئی ڈی کے شاہ صاحب کے ذکر سے کیا ہے۔ پھر کچھ ناول جیسی حکایت۔ بعد ازاں "مختلف شخصیات سے ملاقات" کا مفصل بیان' قائد اعظم' خان لیاقت علی خاں شہید' حسین شہید سہروردی' میاں افتخار الدین' ائر مارشل اصغر خان' اندرا گاندھی' نواب بہادر یار جنگ' ڈاکٹر ضیاء الدین' مولانا ابو الاعلیٰ مودودی' کوثر نیازی' ملک نصراللہ خاں عزیز اور پھر نعیم صدیقی (راقم ہذا)' نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی' نواب مزمل اللہ خاں شیروانی۔ پھر سرمایہ حیات کے تذکرہ شخصیات کا دوسرا سلسلہ آتا ہے۔ شعرا اور دانش ور حضرات اصغر گونڈوی' جگر

مراد آبادی، حفیظ جالندھری، شہرت بخاری، مرزا محمد منور، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، انور مسعود، پروفیسر رشید احمد صدیقی، حکیم احمد شجاع، علامہ صدیقی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، نذیر نیازی، سید قاسم محمود۔ پھر اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کے پروفیسروں کا ذکر چلتا ہے، کچھ شاگردوں کا بھی۔ پھر گوجرانوالہ کے شعرا آتے ہیں۔ اکثر جانے پہچانے اور قریبی ہیں۔ خاصی تعداد ہے۔ ان سب حضرات کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ جیسے کہانیوں کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں، بہت سی معلومات اور کچھ لطائف، کچھ اشعار۔

قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اصل مضمون "میرا نظریہ ادب" ہے جو سرمایہ حیات کا ایک بڑا حصہ ہے۔ خوب لکھا ہے:

اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ادب ایک ہمہ گیر قانون ہے جو کہ ایک تہذیب کا ناگزیر حصہ ہے۔ ادب نہ تو محض واردات قلبی کا نام ہے، نہ محض بیرونی انفعال انسانی کا۔ بلکہ یہ دونوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ ادب معمار تمدن بھی ہے اور تعمیر تمدن بھی۔

اوپر ایک چھوٹا سا جملہ ہم چھوڑ آئے ہیں:

جمالیاتی شعور کو اجاگر کرنا، اس میں توازن، ہم آہنگی اور معیاری لطافت پیدا کرنا ادب ہے۔ ضمیر کو نفس امارہ پر بالادستی عطا کرنا، مذاق سلیم کی جلا کرنا، تہذیب و تمدن کے معیار کو بلند کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ ادب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے میں جھانکتا ہے۔ یہ ہماری خوشی کا بھی ساتھی ہے اور غم کا بھی۔

اور:

میں فن کی آڑ لے کر اسلامی اصول زندگی اور اصول اخلاق سے ہرگز انحراف نہیں کرنا چاہتا۔

(نعیم صدیقی)

عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین، حصہ اول: از افتخار احمد۔ ناشر: المیزان پبلشرز، المعصوم ٹاؤن، فیصل آباد۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت پیپر بیک ۱۱۰ روپے۔ لائبریری ایڈیشن ۱۵۰ روپے۔

پروفیسر افتخار احمد کا نام پاکستان میں اخوان المسلمون پر لکھنے والے کی حیثیت سے تحریکی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ زیر نظر کتاب (جس کا دوسرا متوقع حصہ پاک و ہند کے قائدین کے تذکرے پر مشتمل ہو گا) کی پندرہ شخصیات میں سے سات کا تعلق اخوان المسلمون مصر سے ہے۔ان کے علاوہ حسن ترابی (سوڈان)، نجم الدین اربکان (ترکی)،راشد الغنوشی (تیونس)،عزت بیگووچ (بوسنیا)، اسماعیل فاروقی (امریکا) اور فلسطین سے متعلق امین الحسینی، شیخ احمد یٰسین اور عزالدین القسام کا ذکر ہے۔ (جہاد فلسطین کی بنیاد ڈالی)۔ الجیریا کی عدم موجودگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ان شخصیات پر تحقیقی مطالعے نہیں بلکہ تذکرے ہیں جن میں اصل ماخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مطالعے سے حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور ایمان میں اضافہ۔ حسن البنا شہید، عبد القادر عودہ شہید، سید قطب شہید (شہدا کا کیا عالی مرتبت سلسلہ ہے) اور زینب الغزالی کے تذکرے سے اس دور کے یاد تازہ ہو گئی اور ذہن میں دو سوال ابھرے۔ اول یہ کہ جمال ناصر جیسے جابر حکمرانوں کو ایسے کارندے کیسے مل جاتے ہیں جو اپنی قوم کے بہترین نیک لوگوں پر (جو بلا شبہ زمین کا نمک تھے) ایسے مظالم ڈھائیں جنھیں پڑھنے کا بھی یارا نہیں ہوتا۔دوسرے یہ کہ اب یہ کیا ہو گیا ہے کہ الجیریا،مصر اور معلوم نہیں کہاں کہاں، اسلام کا نام لینے پر سلسلہ مظالم جاری ہے لیکن ہمارے لیے یہ بس ایک خبر ہی ہے۔مناسب ردعمل سامنے نہیں آتا۔یہ کیسی عالمی تحریک اسلامی ہے؟

۱۹۵۶ میں الجزائر میں فرانسیسی فوج کی فائرنگ سے چند افراد کی ہلاکت کی خبر صبح کے اخبارات میں آئی تو ۱۰ بجے تک کراچی کے تمام کالجوں میں ہڑتال ہو گئی اور احتجاجی جلوس اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے ناظم عمر چھاپرا کی قیادت میں فرانسیسی سفارت خانے تک پہنچ گیا۔ اگلے روز اخبار ڈان نے لکھا کہ طلبہ نے lightning strike کی۔ اب تو ذرائع و وسائل کی بہت بہتر صورت حال ہے۔ اب فیکس کا دور ہے مگر گورازدے کی ۴ ہزار لاشوں کی خبر ایسے ہی گزر گئی ---

اب اصل ضرورتیں دو ہیں: عالمی تحاریک اسلامی کا تحقیقی مطالعہ جو تحقیق کار خود متعلقہ ملک میں سال دو سال گزار کر کرے۔ اور دوسرے یہ کہ ان عظیم قائدین کا ذکر محدود حلقوں سے باہر نکلے اور زبان زد خاص و عام ہو۔ نئے نئے اشاعتی ادارے ایک ایک ہزار پر قناعت نہ کریں، اپنی کتابوں کو چند مکتبوں سے باہر نکال کر ہر بک اسٹال تک پہنچائیں اور ایسی پیاس پیدا کریں (جو موجود بھی ہے) کہ نوجوان اُن کتابوں پر ٹوٹ کر گریں۔

افتخار احمد کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ امید ہے وہ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد منظر عام پر لائیں گے' جو برعظیم پاکستان و ہند کے قائدین کے تذکرے پر مشتمل ہو گا۔ (م - س)

ماسونیت: از محمد صفوت سقا امینی سعدی ابو حبیب' ترجمہ: عبدالوہاب حجازی۔ ناشر: ادارہ البحوث الاسلامیہ والدعوہ' جامعہ سلفیہ بنارس۔ صفحات ۲۴۰۔ قیمت درج نہیں۔

ماسونیت' فری میسنری کا ترجمہ ہے' جس کا نام تو عوام و خواص میں ایک ناپسندیدہ تحریک کی حیثیت سے معروف ہے' لیکن اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ محمد صفوت سقا امینی کی اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس تحریک کا آغاز مختلف آرا کے مطابق' حضرت موسیٰ کے زمانے میں یا قدیم روم میں قدس کے گورنر ہیروڈس ثانی کے عہد میں یا چودھویں صدی عیسوی میں (۱۳۷۶ میں) ہوا۔ پیچیدہ باطنیت کی حامل یہ تحریک جن اصولوں کو اختیار کرنے کا اعلان کرتی ہے' درحقیقت انھی اصولوں کو دنیا سے ختم کرنے کی خواہاں نظر آتی ہے۔ اس تحریک کے بنیادی اصول حریت' مساوات اور اخوت مقرر کیے گئے ہیں لیکن' ہاتھی کے ان دانتوں کے پیچھے جو "اصول پوشیدہ" ہیں' ان میں شیطان اور مادے کو نور اور خیر کے الٰہ تسلیم کیا جاتا ہے' جو مذکورہ ظاہری اصولوں کے واضح نقیض ہیں۔

مصنف نے کتاب کو مختلف ابواب' نام اور تاریخ' اصول و ضوابط' ماسونیت اور ادیان' ماسونیت اور عالم وغیرہ میں تقسیم کیا ہے۔ ماسونیت اور ادیان کے باب میں مختلف ادیان اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ فری میسنریوں کے طرزِ عمل اور افکار کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ تحریک دراصل یہودی فکر کی پیداوار ہے' خواہ اس کا قیام عہدِ موسیٰ میں ہوا ہو یا اس کے بعد۔ یہی بات علامہ رشید رضا مصری نے اپنے ایک فتویٰ میں بدیں معنی فرمائی تھی۔

یورپ میں رونما ہونے والے سیاسی انقلابات میں اس تنظیم کا زبردست اثر رہا ہے۔ انقلاب فرانس اور اس کے بعد عثمانی اور پرتگالی انقلاب بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے مؤسس اور اس میں کام کرنے والے یورپ میں نصاریٰ اور یہود ہیں' البتہ یہود ان کے قائد ہیں اور رازدانِ درونِ خانہ بھی' اس لیے کہ یورپ میں ماسونیت (فری میسنری) نے جن انقلابات کی کوشش کی ہے' یہودی سب سے زیادہ ان سے نفع اندوز ہوئے ہیں۔ یہی حال بلادِ عثمانیہ میں بھی رہا۔

زیرِ نظر کتاب میں مسلم حکومتوں کے زوال اور دنیا کے دیگر انقلابات میں فری میسنریوں کے اسی کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ضمیمے کے طور پر برطانوی وزیر خارجہ کے نام برطانوی سفیر کے ۲۹ مئی ۱۹۱۰ کے ایک خفیہ اور طویل خط کا مکمل متن بھی شامل ہے' جو اس موضوع پر ایک نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب میں فری میسنریوں کی مختلف اقسام' ان کے عقائد' ان کی زبان' کیلنڈر اور تقویم وغیرہ کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ کتاب اپنے محتویات کے اعتبار سے مجموعی طور پر معلومات افزا ہے لیکن اوّل سے آخر تک کتاب کے مخاطب کا تعین نہیں ہو پاتا کہ آیا یہ کتاب ایک عام آدمی کو اس تحریک کا تعارف کرانے کے لیے ہے یا ایک ایسے قاری کے لیے جو پہلے ہی اس تحریک کے اسرار و رموز سے آشنا ہے۔ اسلوب اور انداز بھی اسی دو رنگی کا شکار ہے' بعض مقامات پر خوب دادِ تحقیق دی گئی ہے' لیکن بعض مقامات پر مصنف کا انداز سرسری ہے' مثلاً:

"یہ تحریک جب پھیل گئی تو فکرِ انسانی اس کے وقتِ قیام کی تحقیق میں تاریخ کے دفاتر الٹنے لگی' جو ایک سعیِ لا حاصل ہے۔ ہمارے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ تحریک روئے زمین کے کسی ایک غار میں قائم ہوئی' ہم نہیں جانتے کہ وہ غار کہاں واقع ہے اور یہ تحریک کب قائم ہوئی' اس کے ماں باپ اور اسے پروان چڑھانے والے کون ہیں؟" (ص ۴۱)

ظاہر ہے یہ انداز و اسلوب کسی تحقیقی کتاب کے شایان شان نہیں ہے' تاہم اردو میں اس موضوع پر یہ ایک مفید کاوش ہے۔ عبد الوہاب حجازی کا یہ ترجمہ' جو ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی تقدیم و مراجع سے مزین ہے' عمرانیات اور سیاسیات و تاریخ کے دائروں میں کام کرنے والوں کے لیے راہنما ثابت ہوگا۔ (زاہد منیر عامر)

وادی کا خیال رکھنا: از نجمہ ثاقب۔ ناشر: ادارہ مطبوعات سلیمانی' اردو بازار' لاہور۔ صفحات ۳۰۴۔ قیمت ۸۴ روپے۔

"مظلوم کشمیری مسلمانوں کی داستانِ حریت" پر مبنی ۲۰ افسانوں کا یہ مجموعہ ایک طالبہ کی کاوش ہے اور اس اعتبار سے جہاد بالقلم کی ایک اچھی مثال ہے۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں نجمہ ثاقب نے ایک باصلاحیت افسانہ نگار کی طرح تخیل' مشاہدے اور مطالعے کو دلچسپ اسلوب میں

پیش کیا ہے۔

زیرِ نظر افسانوں میں آزادی کی جدوجہد میں پیش آنے والے جملہ ممکنہ مراحل کی جھلک ملتی ہے۔ گذشتہ ۴ ' ۳ برسوں سے تحریک آزادیِ کشمیر کی جو تفصیل اخبارات و رسائل کے ذریعے سامنے آرہی ہے' افسانہ نگار نے ان واقعات اور صورتِ حال کو افسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بھارتی فوج کے انسانیت سوز مظالم' تفتیشی مراکز میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات' گھر گھر تلاشی' مار پیٹ' لوٹ مار' بے حرمتی' قتل و غارت گری---- یہ سب محض اس لیے کہ وہ آزادی چاہتے ہیں۔ نجمہ ثاقب نے تلخ اور تکلیف دہ حقائق کو مختلف کرداروں کے روپ میں ڈھالا ہے۔ ان کرداروں میں جذبہ جہاد سے سرشار دست بدست لڑائی کرنے والے بھی ہیں' حریت پسندوں کو اخلاقی اور روحانی سہارا دینے والے عام کشمیری باشندے بھی اور اس کے برعکس غدارانِ وطن بھی' شاید یہ طویل غلامی کا اثر تھا کہ آغاز میں بہت سے کشمیریوں کا رویّہ تحریکِ آزادی سے لاتعلقی کا تھا۔ مثلاً "جب میں نے کلاشنکوف اٹھائی" کا اقبال ان لوگوں میں سے تھا جو ہر حال میں "پر امن رہنا چاہتے ہیں"۔ اس کا سارا دن دفتر میں فائلوں کے ساتھ گزر جاتا' "یس سر' ٹھیک سر' ایسا ہی ہے سر' میری دنیا بس یہاں تک محدود تھی"۔ مگر بھارتی فوج اس کے پورے گاؤں سے سامانِ خورد و نوش جمع کر کے لے گئی۔ اور اسی پر بس نہیں' خواتین کی آبرو بھی محفوظ نہ رہی' تو اقبال نے بے اختیار ہو کر کلاشنکوف اٹھالی۔

جہادی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ افسانوں میں بھارت کی ان کوششوں کا بھی ذکر ہے جو وہ کشمیریوں میں مسلم تشخص کے خاتمے کے لیے کرتا رہا ہے۔ "روشنی کا سفر" اور "اعتراف" ایسے ہی افسانے ہیں۔

کتاب کی طباعت' سرورق اور جلد بندی کا معیار اطمینان بخش ہے' مگر کمپوزنگ میں رموزِ اوقاف کا خاطر خواہ خیال نہیں رکھا گیا۔ جہادِ کشمیر کے حوالے سے تخلیق ہونے والے ادب میں' یہ مجموعہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ (ز - ج)

وضاحت

۱- ترجمان القرآن میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲- تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳- تبصرے کے لیے مطبوعات براہ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ' لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

مدیر کے نام

حکیم نعیم الدین زبیری، کراچی

اشاریہ ترجمان القرآن پر تبصرہ (مئی ۹۴) کے حوالے سے، دل چاہتا ہے کہ ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ یہ کام ادارہ معارف اسلامی یا کسی اور نے مجھ سے نہیں کروایا تھا، بلکہ یہ میری اپنی ضرورت اور خواہش کی تکمیل تھی، جسے پورا کر کے میں نے مولانا مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ کام نہ تو کسی معاوضہ کے لیے میں نے کیا تھا، نہ میں نے سوائے ۲۰ مطبوعہ نسخوں کے کوئی معاوضہ لیا۔ اگر رسائل و جرائد میں اس پر تبصرے آجاتے تو نہ صرف اہلِ علم اور اربابِ تحقیق اس خدمت سے استفادہ کرتے بلکہ کتاب کی نکاسی بھی ہو جاتی۔ ترجمان القرآن ہی اس کو متعارف کرواتا تو اچھا تھا۔ آپ نے نہ معلوم کیوں یہ چند سطریں تحریر فرما دیں۔ ورنہ میں تو اس کتاب کو کب کا بھول چکا تھا۔ اب اتنی محنت کون کرے گا کہ شائع شدہ اشاریے کے معیار اور ترتیب کو نظر میں رکھ کر بقیہ جلدوں کا اشاریہ مرتب کرے۔

پروفیسر نگہت منصور، گوجرانوالہ

مئی ۱۹۹۴ کے شمارے میں "ترجمان القرآن" کے اشاریے ۱۹۳۲ - ۱۹۷۶ء پر تبصرہ نظر سے گزرا۔ محترم مبصر صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ترجمان کے باقی شماروں کا بھی اشاریہ بنایا جائے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ترجمان القرآن جنوری ۱۹۷۷ سے دسمبر ۱۹۹۳ تک کے تمام شماروں کا ہم نے مفصل اشاریہ مرتب کرایا ہے، جو کہ ایم اے اسلامیات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ادارہ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں جمع کرا دیا گیا ہے۔ یہ سطور اس لیے لکھی جا رہی ہیں کہ آپ کی توجہ دلانے پر کوئی فرد اپنے قیمتی وقت کو محض تکرار میں صرف نہ کردے۔

ڈاکٹر رضوان ندوی، کراچی

آپ کی ادارت میں "ترجمان القرآن" کی نئی اور دیدہ زیب شکل و صورت اور متنوع مضامین پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس نئے انداز و اسلوب کو باعث خیر کرے۔ "ترجمان القرآن" جنوری ۱۹۹۴ دیکھ رہا تھا، صفحہ ۸۱ پر کتاب نما کے تحت مترادفات القرآن پر تبصرے میں کتاب کا نام "مترادفات القرآن مع فروق اللغویہ" تحریر ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "فروق اللغویہ" بڑی بھونڈی غلطی ہے، یہ نہیں ہو سکتا۔ صفت موصوف کا عربی کا قاعدہ تو آپ کو بھی معلوم ہو گا۔ اسے "الفروق اللغویہ" ہونا چاہیے۔ یہ

ناقابل برداشت غلطی ہے ۔ ترجمان القرآن میں اس کو نہ ہونا چاہیے ' ویسے میں نے ہندوپاک کے علما کی تحریروں میں یہ غلطی اکثر دیکھی ہے ۔ پھر بڑی ضرورت یہ تھی کہ ان مترادفات میں جو باریک اور بعض اوقات نمایاں فروق ہیں ' ان کو واضح کیا جاتا ' جس کی طرف تبصرہ نگار نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے ۔ ص ۵۱ پر علال الفاسی کے بجائے "علال ' الفاس" غلط ہے ۔ ص ۵۵ پر "محمد بن محمد السنوسی" غلط ہے کیوں کہ وہ مغربی حملہ سے پہلے انتقال کر چکے تھے ' یہاں صحیح احمد بن محمد الشریف السنوسی ہے ' جنھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ امیر عبد الکریم الریفی کا بھی پورا نام امیر شکیب ارسلان کے مطابق محمد بن عبد الکریم الریفی ہے ۔ اگرچہ مغربی ماخذ میں وہ عبد الکریم کے نام سے مشہور ہیں۔ صفحہ ۵۰ پر ترکی میں عربی زبان میں اذان کا قصہ ۱۹۵۶ کا نہیں بلکہ ۱۹۵۰ کا ہے۔

شاہ بلیغ الدین ' کراچی

آپ کا پرچہ ملتا رہتا ہے۔ اس کی نئی سج دھج بھی دیکھ رہا ہوں۔ علم اور دین کی خدمت کی جو صورت بھی میسر آجائے اللہ کا کرم ہے۔

کرنل غلام سرور ' راولپنڈی

ترجمان القرآن کی صُوری اور معنوی خوبیوں کی تعریف نہ کرنا بخل ہو گا۔ جریدہ ' ماشاء اللہ ' معیار کے اعتبار سے بلند مقام پر فائز دکھائی دیتا ہے۔

زہیر ملک ' گلاسکو (برطانیہ)

میرے لیے رسالہ کا سب سے اہم حصہ رسائل و مسائل ہے۔ اگر اس کے صفحات زیادہ کیے جا سکیں تو بہت اچھا ہو۔ مجھے جوابات کا انداز پسند ہے جو مولانا مودودیؒ کے اصل انداز کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ عملی بات ہوتی ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے سے ہوتی ہے۔

اللہ داد نظامی ' جھوک نواز (وہاڑی)

مئی کے پرچہ میں ' فہم حدیث نے اپنی کمی کا شدید احساس دلایا۔ مضامین کا تنوع اور موضوعات میں توازن اس قدر ہے کہ ہر کسی کو اپنی دلچسپی کا سامان نظر آتا ہے۔ تاہم شعر و ادب کے حوالے سے ابھی تک کوئی تحریر سامنے نہیں آئی۔

عبد الحئی ابڑو ' اسلام آباد

بلا شبہ خدمتِ دین کے حوالے سے ۲۱ ویں صدی کا استقبال ' ترجمان نے بہت خوب انداز سے کیا ہے۔ ترجمان اب امتِ مسلمہ کا حقیقی رہنما رسالہ ثابت ہو رہا ہے۔


ہو رُوم کُولر یا واشنگ مشین
جدید، پائیدار اور حسین
UNITED
سلیم الیکٹرک انڈسٹری



احباب پارک
ملتان روڈ لاہور
گلشن احباب
فیز I ملتان روڈ لاہور
گلشن احباب
فیز II ٹاؤن فیروزپور روڈ لاہور
منظر کوہسار
اسلام آباد
شاداب کالونی
فیروز پور روڈ لاہور
پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر
احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے
حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر
منظر کوہسار
ترقیاتی کام جاری ہیں
ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور
ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں
سیوریج، بجلی پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان
مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل
۳۱ جولائی تک رعایتی قیمت پر
سولہ ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات
باقی رقم تین سال کی قسطوں میں،
تین ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر
بکنگ کرالیں پلاٹ ۲ کنال ۱۰ مرلہ
۵ مرلہ۔ کنال = ۶۰۰ مربع گز
خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھائیں۔
فیروزپور روڈ پر چونگی امرسدھو سے ۲ کلومیٹر
ایل ڈی اے سے منظور شدہ
شاداب کالونی
کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری۔
سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت
موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر
ترقیاتی کام جاری ہیں۔ کنال = ۵۰۰ مربع گز
قیمت ۲۰ ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات
ایک ہزار روپے فی مرلہ کی رعایت
۳۱ جولائی تک بڑھادی گئی ہے۔
۳ ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے بکنگ کرالیں
باقی رقم تین سال کی آسان قسطوں میں
پمفلٹ مفت منگوائیں۔
گلشن احباب فیز II ٹاؤن فیروزپور روڈ میں ... بکنگ جاری ہے
شاداب کالونی فیروزپور روڈ میں ... بکنگ جاری ہے
تحریک اسلامی سے
وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ
احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ
شریف چیمبر 68 مزنگ روڈ لاہور فون 6361501-6366005-304754 فیکس 6369520

REGD. NO. L 5340

234014
236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE